Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

۱۶ اگست ۲۰۲۵ء | بسم اللہ الرحمٰن الرحیم | جلد نمبر: ۱۸ ۔ شمارہ نمبر: ۱۶

پندرہ روزہ
معارف فیچر کراچی
MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، محمود الحق صدیقی، نوید نون ۔ معاون مدیران: غیاث الدین، م ع فاروقی

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰

فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱۔۳۶۳۴۹۸۴۰ (۲۱۔۹۲)

برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

۱ ۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔

۲ ۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلا تبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون، نقطۂ نظر، خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں، اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔

۳ ۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

۴ ۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید، لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵ ۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

ٹرمپ بھارت کو کیوں بخش نہیں رہے؟

Alex Kozul-Wright

امریکا نہیں چاہتا کہ رُوس سے تیل خریدا جائے۔ جو مُمالک روس سے تیل خریدتے ہیں، اُنھیں امریکا اور اُس کے چند اتحادیوں کی ناراضی مَول لینا پڑتی ہے۔ یوکرین جنگ کے نتیجے میں روس کو مغربی طاقتوں کی ناراضی جَھیلنا پڑ رہی ہے۔ اُس کے دوستوں کو بھی مغرب کی طرف سے ناراضی کا سامنا رہا ہے۔

امریکی قیادت بھارت سے اِس بات پر ناراض ہے کہ وہ روس سے سَستا خام تیل خرید رہا ہے۔ دوسری طرف چین بھی روس سے بہت بڑے پیمانے پر خام تیل خرید رہا ہے مگر امریکا اِس معاملے میں چین سے زیادہ ناراض نہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ تعلقات بہتر بنانے کی راہ پر گامزن ہے۔ 'ٹیرف جنگ' کے باوجود امریکا چاہتا ہے کہ چین سے معاملات زیادہ نہ بگاڑے جائیں یا زیادہ نہ بگڑنے دیے جائیں۔

ایسا کیوں ہے؟ کیا امریکا کو صرف اپنے مفادات عزیز ہیں؟ یقیناً ایسا ہی ہے۔ ہر مُلک اپنے مفادات کو عزیز رکھتا ہے مگر امریکا اِس معاملے میں کئی قدم آگے جا کر سوچتا ہے اور وہی کرتا ہے جس کے نتیجے میں اُس کے اپنے مفادات کو تحفظ ملتا ہو۔ پھر چاہے فریقِ ثانی کا بیڑا غرق ہی کیوں نہ ہو جائے۔

امریکا کے صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے دھمکی دی ہے کہ وہ روس پر نئی پابندیاں تھوپیں گے اور جو ممالک روس سے خام تیل خریدیں گے، اُن کے خلاف بھی بہت بڑے پیمانے پر کارروائیاں کی جائیں گی۔ ان پابندیوں کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ روس پر دباؤ بڑھے اور وہ یوکرین میں جنگ روک دے۔

صدر ٹرمپ نے اگست کے دوران مزید ۲۵ فیصد ٹیرف عائد کیا ہے جس کے بعد بھارت کی مصنوعات پر ٹیرف بڑھ کر ۵۰ فیصد ہو گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بھارتی مصنوعات اب امریکیوں کو زیادہ مہنگی پڑیں گی۔ اِس کے نتیجے میں بھارت کی برآمدات کو جھٹکا لگے گا۔ یہ اِقدام روس سے خام تیل خریدنے کی بنیاد پر ہے جبکہ چین کے خلاف ایسا کوئی خصوصی اقدام کرنے سے گُریز کیا گیا ہے جبکہ وہ بھی روس سے بہت بڑے پیمانے پر خام تیل خرید رہا ہے۔

ایسا کیوں ہے کہ صدر ٹرمپ اور اُن کے ساتھی روس کا خام تیل خریدنے پر بھارت کو تو پابندیوں میں جکڑ رہے ہیں مگر چین کے خلاف جانے سے واضح طور پر گُریزاں ہیں؟ ایک اہم سوال یہ ہے کہ روس سے خام تیل کون کون خرید رہا ہے اور اِس عمل کو روکنے کے لیے صدر ٹرمپ کیا کچھ کر سکتے ہیں۔

روسی خام تیل کا سب سے بڑا خریدار چین ہے جس نے گزشتہ برس ۱۰ کروڑ ۹۰ لاکھ ٹن خام تیل خریدا۔ یہ مقدار چین کی توانائی کی مجموعی درآمدات کا ۲۰ فیصد ہے۔ اِس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ چینی معیشت کے لیے اِس وقت روسی خام تیل کس قدر اہم ہے۔

۲۰۲۴ء کے دوران بھارت بھی روسی تیل کی خریداری میں پیچھے نہیں رہا۔ اُس نے ۸ کروڑ ۸۰ لاکھ ٹن روسی خام تیل خریدا۔ اِس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بھارتی معیشت کے لیے اِس وقت روس کا سَستا خام تیل کس قدر اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

روسی خام تیل چینی معیشت کے لیے بہت اہم ہے اور چین کا روس سے اِتنے بڑے پیمانے پر خام تیل خریدنا یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ یوکرین سے جنگ کے دوران روسی معیشت کو پہنچنے والے نقصان کے اِزالے کے لیے چین کس قدر اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ روس کو زیادہ سے زیادہ مالی وسائل کی ضرورت ہے۔ وہ خام تیل، گیس اور معدنیات کی فروخت بڑھا رہا ہے تاکہ قومی خزانہ بھرا رہے اور جنگ جاری رکھنے میں مدد مِل سکے۔ یہ جنگ اَب چوتھے سال میں داخل ہو چکی ہے۔ ساڑھے تین سال قبل شروع کی جانے والی جنگ میں روس کو اب تک غیر معمولی نقصان کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ کبھی کبھی تو واضح طور پر محسوس ہوا کہ اب یہ جنگ روس بس ہار ہی جائے گا مگر پھر کچھ ایسا ہوا جس نے روس کو مضبوط کیا اور جنگ جاری رہی۔

امریکا میں دونوں بڑی جماعتوں کے قانون ساز ایک مدّت سے ایسا مسودۂ قانون لانے کی بھرپور تیاری کرتے رہے ہیں جس کا بنیادی مقصد صرف یہ ہے کہ کسی نہ کسی طور ہر اُس مُلک کو نشانہ بنایا جائے جو روس سے خام تیل اور گیس خرید رہا ہے۔

یہ بِل صدر ٹرمپ کو یہ اختیار دے گا کہ اگر کوئی مُلک روسی تیل خریدنے سے باز نہ آئے تو اُس پر ۵۰۰ فیصد تک ٹیرف

اندرونی صفحات پر

- جاپان میں امریکی کاروں کی فروخت کم کیوں؟
- غزہ: 'برادر! میں نے تین دن سے کچھ نہیں کھایا'
- چین کے ساتھ تعلقات: بھارتی خارجہ پالیسی کا یوٹرن
- 'ابنارمل ریاست' کے پہلو میں 'فلسطینی ریاست' کی باتیں
- یورپ اور ایشیا کے درمیان معلق روس
- پیوٹن کی احمقانہ جنگ
- فلسطینی صحافیوں کی اَموات پر ماتم نہ کیجیے!

عائد کر دیا جائے۔ امریکی سینیٹرز اِس بل کے لیے صدر ٹرمپ کی طرف سے گرین سگنل کا انتظار کرتے رہے ہیں۔

آخر کیا سبب ہے کہ صدر ٹرمپ چین کے خلاف غیر معمولی ٹیرف کی راہ پر گامزن نہیں ہو رہے؟ ایسی کون سی بات ہے جو اُنہیں چین کے خلاف فیصلہ کن قسم کے اقدام سے روک رہی ہے؟

جب 'فاکس نیوز' نے ۱۵؍اگست کو الاسکا میں سربراہ ملاقات کے دوران روسی صدر ولادیمیر پیوٹن کی طرف سے یوکرین جنگ میں سیز فائر پر رضامندی سے صاف انکار کے بارے میں پوچھا تو ٹرمپ نے کہا کہ ابھی میں اِس حوالے سے کچھ بھی نہیں سوچ رہا یعنی روس کی طرف سے جنگ روکنے سے صاف انکار کے باوجود امریکی صدر روس اور چین کے درمیان جاری اقتصادی اشتراکِ عمل کی روک تھام کے لیے کچھ بھی کرنے سے صاف گریز کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ وہ جو کچھ بھی کر رہے ہیں (یعنی نہیں کر رہے ہیں) وہ وسیع تر امریکی مفادات کو زیادہ سے زیادہ تحفظ فراہم کرنے کے لیے ہے۔ صدر ٹرمپ کا کہنا ہے کہ روس سے خام تیل کی خریداری جاری رکھنے پر چین کے خلاف کسی بھی بڑے اقدام کے لیے دو تین ہفتے تو سوچنا ہی پڑے گا اور اِس کے بعد ہی کچھ طے کیا جا سکے گا۔

سیاسی، معاشی اور اسٹریٹجک اُمور کے تجزیہ کار کہہ رہے ہیں کہ امریکی صدر کچھ وقت چاہتے ہیں تاکہ چین سے وسیع تر معاشی مذاکرات کامیاب ہوں اور رَیئر اَرتھ کہلانے والی معدنیات سے متعلق کوئی جامع معاہدہ طے پا جائے۔

اس وقت دنیا بھر میں رَیئر ارتھ منرلز کا غلغلہ ہے۔ چین دنیا بھر سے یہ معدنیات خرید رہا ہے۔ بھارت بھی اس حوالے سے بہت فکر مند دکھائی دے رہا ہے۔ یہ معدنیات جدید ترین ٹیکنالوجی کی مدد سے تیار کی جانے والی اشیا کی تیاری میں غیر معمولی کردار کی حامل ہیں۔ ٹیکنالوجی کے میدان میں پوری دنیا بھرپور مسابقت کر رہی ہے۔ ایسے میں اہم ترین معدنیات کا بہت بڑے پیمانے پر موجود ہونا لازم ہے۔ چین اِس شعبے میں اپنی برتری قائم کرنے کی بھرپور کوشش کر رہا ہے اور ایسا کرنے میں وہ بہت حد تک کامیاب بھی ہے۔

رَیئر ارتھ ایسی ۱۷؍معدنیات ہیں جو بہت سی مینوفیکچرنگ انڈسٹریز کے لیے انتہائی بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان صنعتوں کا تعلق آٹو پارٹس سے ملٹری ٹیکنالوجی تک سے ہے۔ چین ایک طویل مدّت سے دنیا بھر میں بہت بڑے پیمانے پر کان کنی کے حُقوق خرید رہا ہے۔ افریقا سے معدنیات نکالنے کے حوالے سے اُس کی سرمایہ کاری بہت زیادہ ہے۔ چین نے افریقا سے رَیئر ارتھ منرلز بہت بڑے پیمانے پر حاصل کی ہیں اور اُن کی بنیاد پر اپنی صنعتی بنیاد کو قابلِ رشک حد تک توانا کر دیا ہے۔

امریکا میں بہت سی صنعتیں اب چین سے منگوائی جانے والی معدنیات پر منحصر ہیں۔ امریکا اور چین کے درمیان جاری تجارتی بات چیت میں معدنیات کا موضوع کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔

روسی تیل کی خریداری پر بھارت کے خلاف اقدامات اور چین کو رعایت دینے کی پشت پر ایک بڑی منطق یہ ہے کہ امریکی صدر اِس مرحلے پر چین سے کوئی بڑا تجارتی مناقشہ نہیں چاہتے۔ امریکا بھر میں ریٹیلرز اور ہول سیلرز کرسمس کے حوالے سے چین سے بہت کچھ منگوا رہے ہیں۔ امریکا میں کرسمس پر جو کچھ بھی فروخت ہوتا ہے، اُس کا نصف سے زیادہ تو چین ہی سے آتا ہے۔ اِس معاملے میں چینی صنعتی ادارے بھی خاص تیاری کرتے ہیں۔ اُنہیں آرڈر کم و بیش پانچ ماہ قبل مِل جاتے ہیں تاکہ مال کرسمس سے کم و بیش ایک ماہ قبل تک بھیج دیا جائے۔ اِس وقت چین بھر میں ہزاروں بڑے کارخانے امریکا اور یورپ میں کرسمس کے لیے مال تیار کرنے میں مصروف ہیں۔ چین بھی نہیں چاہے گا کہ اِس مرحلے پر امریکا کی طرف سے کسی نوعیت کی تادیبی کارروائی ہو۔ یہی سبب ہے کہ وہ بھی چند ایک معاملات میں امریکا کو رعایت دے رہا ہے۔

صدر ٹرمپ نے چند ہفتوں کے دوران بھرپور کوشش کی ہے کہ چین سے تجارت کے معاملے میں کوئی بڑا تنازع کھڑا نہ ہو۔ ہاں، جہاں ضرورت پڑتی ہے وہاں گنجائش نکال کر وہ چین کے خلاف کوئی نہ کوئی اِقدام ضرور کرتے ہیں۔ چین کو سیمی کنڈکٹرز کی ضرورت بڑے پیمانے پر ہے۔ امریکا سیمی کنڈکٹرز کا بڑا سپلائر ہے۔ چین کو اس معاملے میں امریکا پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ اگست کے دوران صدر ٹرمپ نے چین کو سیمی کنڈکٹرز کی سپلائی محدود کرنے کے حوالے سے خصوصی اقدامات کیے۔ چینی حکومت بھی اچھی طرح جانتی ہے کہ تجارتی جنگ میں ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ وہ اِس کھیل کے اصول اور طریقے سمجھتی ہے، اِس لیے امریکا کے کسی بھی تجارتی اقدام پر محض جذبات میں ڈوبا ردِعمل نہیں دِکھاتی بلکہ جہاں تک ہو سکتا ہے، جذبات قابو میں رکھ کر تعقّل پر مبنی فیصلے کرتی ہے۔

صدر ٹرمپ نے ۱۱؍اگست کو امریکی کمپنی این وڈیا کو اجازت دی کہ چین کو جدید ترین چپس فراہم کرے۔ اس چپس کی فروخت کا ۱۵؍فیصد امریکی خزانے میں جائے گا۔ این وڈیا اِس پر بھی راضی ہے۔ واضح رہے کہ صدر ٹرمپ نے کچھ مدت پہلے این وڈیا کو چپس چین کو فراہم کرنے سے روک دیا تھا۔

'سی این بی سی' سے گفتگو کے دوران امریکا کے وزیرِ خزانہ اسکاٹ بیسنٹ کا کہنا تھا کہ چین کے خلاف ثانوی درجے کے اقتصادی اقدامات کی گنجائش اس لیے کم رہ گئی ہے کہ اُس نے روس سے خام تیل کی ایک بڑی کنسائنمنٹ یوکرین جنگ سے پہلے حاصل کی تھی۔ ہاں، اب روسی تیل کی خریداری کے معاملے میں چین خاصا آگے بڑھ چکا ہے مگر ایسا نہیں ہے کہ ٹرمپ انتظامیہ نے اِس طرف سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ تمام معاملات کا جائزہ لیا جا رہا ہے اور تمام ممکنہ عواقب پر غور کر کے ہی کوئی قدم اٹھایا جائے گا۔ چین بہت سے ملکوں اور ذرائع سے خام تیل خریدتا ہے۔ اِس پورے معاملے کو نہایت باریکی سے دیکھنا ہوگا۔ اسکاٹ بیسنٹ کا یہ بھی کہنا تھا کہ روس سے خام تیل کی خریداری میں بھارت اور چین کے طریقِ کار میں بہت فرق ہے۔ بھارت جس طور روسی تیل خرید رہا ہے، چین اُس سے مختلف طریق اختیار کر رہا ہے۔ یہ ایسی حقیقت ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اسکاٹ بیسنٹ کا کہنا ہے کہ چین کی حکومت یوکرین جنگ سے پہلے بھی روس سے خام تیل خرید رہی تھی جبکہ بھارت نے موقع غنیمت جان کر زیادہ منافع کے لیے ایسا کرنا شروع کیا ہے۔ اُن کا یہ بھی کہنا تھا کہ یوکرین جنگ سے قبل بھارت روس سے اپنی ضرورت کا صرف ایک فیصد خام تیل خرید رہا تھا۔ اب وہ کم و بیش ۴۲ فیصد خرید رہا ہے۔ اِس سے صاف پتا چلتا ہے کہ بھارتی قیادت بہتی گنگا میں ہاتھ دھو رہی ہے۔ امریکی وزیرِ خزانہ نے الزام لگایا کہ بھارت بہت بڑے پیمانے پر روسی خام تیل خرید کر اُسے صاف کر کے بلند نرخ پر فروخت کر رہا ہے اور یوں نفع خوری میں مُبتلا ہے۔ اسکاٹ بیسنٹ نے بتایا کہ بھارت میں جو کاروباری گھرانے روسی خام تیل بڑے پیمانے پر خرید رہے ہیں، اُنہوں نے اب تک کم و بیش ۱۶؍ارب ڈالر کا اضافی منافع کمایا ہے۔ اِس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ روس سے خام تیل خریدنے میں بھارت اِتنی زیادہ دلچسپی کیوں لے رہا ہے۔ سوال صرف نفع خوری کا ہے۔ بھارتی عوام کو اِس کا کچھ فائدہ نہیں پہنچ رہا۔ اُنہیں پٹرول اور ڈیزل اب بھی پُرانے نرخوں ہی پر فروخت کیا جا رہا ہے۔

امریکی ایوانِ صدر میں تجارت کے مشیر پیٹر نیوارو نے بھی

بھارت پر یوکرین جنگ میں روس کی مالی مدد کا الزام عائد کیا ہے۔ اگست کے اوائل میں وائٹ ہاؤس کے ڈپٹی چیف آف اسٹاف اسٹیفن مِلر نے کہا تھا کہ بھارت کی طرف سے روس سے بہت بڑے پیمانے پر خام تیل خریدنا قابلِ قبول نہیں ہے۔ اُن کا استدلال تھا کہ نئی دہلی بالواسطہ طور پر ماسکو کے ہاتھ مضبوط کر رہا ہے تاکہ وہ یوکرین میں جنگ جاری رکھ سکے۔

امریکی نائب صدر جے ڈی وینس بھی بھارت کی طرف چین کے خلاف اقدامات کے حوالے سے خاموشی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ ۱۲/اگست کو جب اُن سے پوچھا گیا ہے کہ بھارت کو تو روس سے خام تیل کی خریداری پر ۲۵ فیصد اضافی ٹیرف کا سامنا کرنا پڑا ہے، کیا واشنگٹن ایسا ہی اقدام چین کے خلاف بھی کرے گا تو اُنہوں نے کچھ کہنے سے صاف گُریز کیا۔

جے ڈی وینس نے بعد میں کہا کہ بھارت کے خلاف تو اقدامات کیے گئے ہیں مگر چین کا معاملہ بہت مختلف ہے کیونکہ چین کے ساتھ بہت سے درجوں اور مدوں میں تجارتی تعلقات ہیں۔ اگر روسی تیل کی خریداری پر چین کے خلاف اقدامات کیے گئے تو بہت سے معاملات متاثر ہوں گے جن کا اس معاملے سے کوئی تعلق ہے ہی نہیں۔ یہی سبب ہے کہ چین کے خلاف کوئی بڑا اقدام کرنے سے صدر ٹرمپ کو بہت سوچنا پڑے گا، بہت سے معاملات کو ذہن نشین رکھنا پڑے گا تاکہ مجموعی طور پر پوری معیشت متاثر نہ ہو۔

امریکی نائب صدر کی بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ امریکا ہو یا کوئی اور طاقت، جب اپنے مفادات کی بات آتی ہے تو جُھکنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی جاتی۔ سب کو اپنے بنیادی مفادات زیادہ عزیز ہوتے ہیں۔ یہ مسابقت کی دنیا ہے اور سب کمانے میں لگے ہوئے ہیں۔ ایسے میں کوئی بھی اقدام محض جذبات کی بنیاد پر نہیں کیا جاسکتا۔

امریکی وزیرِ خارجہ مارکو روبیو نے بھی خبردار کر دیا تھا کہ اگر روسی خام تیل کی خریداری اور چین میں اُسے صاف کرنے کی بنیاد پر اقتصادی پابندیاں عائد کی گئیں تو امریکا میں ایندھن اور توانائی کی قیمت میں غیر معمولی نوعیت کا اضافہ ہوسکتا ہے۔

'فاکس نیوز' سے انٹرویو میں مارک روبیو نے کہا کہ چین کے خلاف اقدامات سے معاملات بہت بگڑ سکتے ہیں۔ اگر چین نے روس سے سستا خام تیل خرید کر صاف کیا اور پھر مارکیٹ میں لے آیا تو دنیا بھر میں قیمتیں شدید متاثر ہوں گی اور امریکا سمیت بہت سے ملکوں میں ایندھن اور توانائی کے نرخ ڈانواڈول ہوجائیں گے۔ ہم ایسا کچھ نہیں چاہتے کیونکہ چین کے خلاف جانے سے کئی معاملات بلا سبب بگڑ جائیں گے۔

دوسری طرف چین ڈَٹا ہوا ہے۔ واشنگٹن میں چینی سفارت خانے نے ایک بیان میں کہا ہے کہ روس سے چین کی تجارت پوری کی پوری بین الاقوامی قانون کے مطابق ہے۔ امریکا یا کوئی اور ملک چین پر یہ الزام عائد نہیں کرسکتا کہ چینی حکومت بین الاقوامی قوانین اور اُصولوں کو نظر انداز کر رہی ہے۔

اب ایک بنیادی سوال یہ ہے کہ بلند ٹیرف سے امریکا اور چین کی معیشت کو کس طور فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ یوکرین میں سیز فائر ہونے سے روس پر اقتصادی پابندیاں گھٹیں گی۔ اِس کے نتیجے میں انٹرنیشنل ٹریڈ سسٹم میں بہتری آئے گی۔ اِس سے چین کی معیشت کو بڑھاوا ملے گا۔ چینی حکومت بھی چاہے گی کہ یوکرین جنگ یا تو ختم ہو یا پھر معقول مدّت کے لیے رُک جائے۔

گزشتہ ماہ چینی معیشت میں کئی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اشیا ساز کارخانوں کی سرگرمیاں ماند پڑیں۔ جون کے مقابلے میں سرمایہ کاری کا گراف بھی گرا اور خُوردہ فَروشی کی سطح بھی نیچے آئی۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ امریکی صدر نے چین پر اضافی ٹیرف عائد نہیں کیا تب بھی دوسرے ملکوں پر اضافی ٹیرف عائد کیے جانے سے دنیا کی دوسری بڑی معیشت خاصی متاثر ہوئی۔ چین میں نوجوانوں کی بے روزگاری بھی گیارہ ماہ کی بلند ترین سطح پر پہنچ گئی۔ شہروں میں ۱۶ سے ۲۴ سال کے ایج گروپ میں بے روزگاری کی شرح ۱۷/فیصد سے زیادہ ہے۔ جون میں یہ شرح ۱۴٫۵/فیصد تھی۔

ہانگ کانگ کے ادارے Natixis میں ایشیا و بحرالکاہل کے معاشی اُمور کے شعبے کی سربراہ الیسیا گارشیا ہیریرو نے 'الجزیرہ' سے گفتگو میں کہا کہ چینی معیشت پر امریکی اقدامات کے منفی اثرات ظاہر ہونا شروع ہوگئے ہیں۔ چینی معیشت مجموعی طور پر ایسی نہیں کہ بالکل مطمئن ہوکر بیٹھا جائے۔ الیسیا ہیریرو کا کہنا ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ چین کے کاروباری ادارے اور بینک آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں۔ وہ ثانوی نوعیت کے اقتصادی اقدامات (پابندیوں) کے حوالے سے بھرپور تیاریوں میں مصروف رہے ہیں اور یہ سب کچھ جو بائیڈن کے دور میں شروع ہوگیا تھا۔ چینی معیشت کو مضبوط رکھنے سے متعلق اقدامات بہت پہلے سے کیے جارہے ہیں، تیاریاں پوری ہیں تاکہ جھٹکا کم سے کم لگے۔

چین نے تجارت میں زیادہ سے زیادہ تنوّع یقینی بنانے کی بھرپور تیاری کی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اسٹریٹجک پروڈکٹس اپنے ہاں بنانے پر خاص توجہ دے رہا ہے تاکہ دفاعی معاملات میں دوسروں پر زیادہ انحصار نہ کرنا پڑے۔ ایسے میں چینی حکومت کو اقتصادی پابندیوں کے ذریعے فوری طور پر جھکا دینا کسی بھی ملک کے لیے آسان نہیں ہوسکتا، امریکا کے لیے بھی نہیں۔ امریکا کے لیے چین کی برآمدات بہت زیادہ ہیں۔ اگر ٹرمپ انتظامیہ نے اقتصادی پابندیوں کی راہ پر گامزن ہونے کی کوشش کی تو امریکا میں عام آدمی کے لیے مہنگائی بڑھ جائے گی کیونکہ روزمرہ استعمال کی جو اشیا چین سے درآمد کی جاتی ہیں، اُن کی قیمت بہت بڑھ جائے گی۔ گزشتہ برس چین سے تجارت میں امریکی خسارہ ۲۹۵/ارب ۴۰ کروڑ ڈالر تھا۔ یہ سطح ۲۰۲۳ء کے مقابلے میں ۵٫۸ فیصد بلند تر ہے۔

اِس وقت امریکا اور چین کی تجارت کہاں کھڑی ہے۔ یہ اہم سوال ہے کیونکہ دونوں ممالک ایک دوسرے پر اِس قدر اِنحصار کرتے ہیں کہ تجارتی محاذ آرائی کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ ۱۲/اگست کو امریکا اور چین نے ٹیرف عائد نہ کرنے سے متعلق سمجھوتے میں مزید ۹۰ دن کی توسیع کردی تاکہ مکمل تجارتی جنگ کو ٹالا جاسکے۔ اب چین پر زیادہ ٹیرف عائد کرنے سے متعلق امریکی اقدامات پر ۱۰/نومبر ۲۰۲۵ء تک pause لگ گیا ہے۔ اس سے قبل دونوں ملکوں نے ۱۱/مئی کو ایک دوسرے پر ٹیرف عائد نہ کرنے پر رضامندی ظاہر کی تھی۔

(مترجم: محمد ابراہیم خان)

"Why is the US sparing China, but not India, for importing Russian oil?"

("Aljazeera ". Aug 20, 2025)

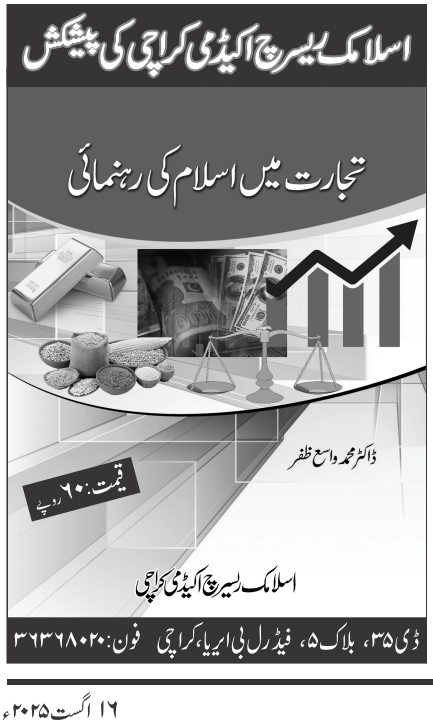

جاپان میں امریکی کاروں کی فروخت کم کیوں؟

Glen S. Fukushima

امریکا اور یورپ کے لیے عالمی معیشت میں انتہائی نوعیت کے چیلنج بڑھتے جارہے ہیں۔ مینوفیکچرنگ سیکٹر میں اِن دونوں خطّوں کے لیے مسابقت انتہائی دشوار ہوچکی ہے اور اب ہائی ٹیک میں بھی جاپان، چین، جنوبی کوریا، تائیوان اور دیگر ممالک نے منہ دینا شروع کردیا ہے۔ امریکا اور جاپان کے لیے برتری کا سب سے بڑا اور واضح میدان دِفاع کا شعبہ رہ گیا تھا۔ اب چین نے دِفاع کے معاملے میں بھی اپنی برتری اور جدّت منوالی ہے۔ امریکا اور یورپ کے لیے معاملات بہت زیادہ اُلجھ گئے ہیں۔

کیا امریکا اور یورپ مِل کر باقی دنیا کو اب بھی اپنا مُطیع وفرماں بردار بنائے رکھنے میں کامیاب ہوسکیں گے؟ ایسا لگتا تو نہیں کیونکہ ٹیکنالوجی عام ہوچکی ہے۔ دنیا بھر میں نئی نسل اِس طرف بہت زیادہ متوجہ ہے۔ ترقی پذیر ممالک بھی جدید ترین ٹیکنالوجی کے شعبے میں اپنے آپ کو منوانے پر کمربستہ ہیں۔ اِس کے نتیجے میں مغربی دُنیا کی برتری مکمل طور پر داؤ پر لگتی، بلکہ مِٹتی دِکھائی دے رہی ہے۔

امریکا کو تجارت کے میدان میں چین کے ساتھ ساتھ جاپان سے بھی غیر معمولی مُسابقت کا سامنا ہے۔ دونوں مُلکوں نے امریکی مارکیٹ کو بہت حد تک اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ جاپان آٹھ عشروں سے اُس کا حلیف چلا آرہا ہے مگر پھر بھی تجارت تو اپنی جگہ ہے۔ جاپانیوں نے ہر دَور میں امریکیوں کو تجارت اور سرمایہ کاری کے حوالے سے ٹف ٹائم دیا ہے اور اَب بھی دے ہی رہے ہیں۔ ٹرمپ انتظامیہ (پارٹ ٹو) کے چند بنیادی مقاصد اور اہداف میں یہ بھی شامل ہے کہ کسی نہ کسی طور جاپانی حکومت کو ملک میں زیادہ امریکی کاریں فروخت کرنے کی راہ ہموار کرنے پر آمادہ کیا جائے۔ اِس حوالے سے مذاکرات کا ڈول ڈالا جاتا رہا ہے۔ جاپانی مارکیٹ میں امریکی کاروں کی فروخت کا گراف بہت گرا ہوا ہے۔ امریکی مُذاکرات کاروں نے تجارتی معاملات دُرست کرنے کے لیے بات چیت کے کئی اَدوار مکمل کیے ہیں۔

۲۰۲۴ء میں جاپان کی کار مارکیٹ کی گنجائش کے صرف ۱۰ فیصد کے برابر امریکی کاریں درآمد کی گئیں یعنی صرف ۱۶ ہزار ۷۰۷، بس۔ یہ اعداد و شمار امریکی سرمایہ کاروں کے لیے بہت مایوس کن ہیں۔ اِس کے مقابلے میں گزشتہ برس ۲۰ لاکھ سے زائد جاپانی کاریں امریکا میں درآمد کی گئیں۔ کاریں بنانے والے جاپانی ادارے امریکا میں بھی کام کررہے ہیں۔ اِن اداروں کی تیار کردہ کاروں کی فروخت کو بھی ذہن نشین رکھا جائے تو امریکا میں کاروں کی مارکیٹ کا ۴۰ فیصد شیئر جاپانی کاروں نے حاصل کیا۔

بڑا سوال

اب ایک بنیادی سوال یہ ہے کہ امریکی کاریں جاپانی مارکیٹ میں اس قدر کم کیوں خرچ ہورہی ہیں۔ کیا یہ سب کچھ جاپان کی طرف سے تجارت کے معاملے میں کھڑی کی جانے والی رکاوٹوں کا نتیجہ ہے یا پھر جاپان نے یہ خاص پالیسی اپنائی ہوئی ہے کہ جاپانی مارکیٹ میں امریکی کاروں کے لیے گنجائش کم سے کم رکھی جائے؟ کیا ایسا ہے کہ جاپانی صارفین امریکی کاروں کو ترجیحی بنیاد پر خرید نہیں رہے؟ یا پھر معاملہ یہ ہے کہ امریکا کے کاریں بنانے والے ادارے ایسی کاریں بنانے میں ناکام ہیں جو جاپانی صارفین کی ضرورت کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہوں؟

۱۹۹۶ء میں، جب میں اے ٹی اینڈ ٹی جاپان کا نائب صدر اور امریکی چیمبر آف کامرس جاپان کا نائب صدر تھا، کمپنی نے مجھے ایک کار دی اور ڈرائیور کی خدمات بھی فراہم کیں۔

جاپان میں امریکی سفیر اور جمی کارٹر دور کے امریکی نائب صدر والٹر مونڈیل نے جب دیکھا کہ مجھے نسان سیما کار دی گئی ہے تو اُنہوں نے مشورہ دیا کہ میں اِس کی جگہ امریکی کار مانگ لوں۔ یہ مشورہ اُنہوں نے اے ٹی اینڈ ٹی اور چیمبر آف کامرس میں میرے کردار کو دیکھتے ہوئے دیا تھا۔ جب میں نے اُن کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے امریکی کار مانگی تو جنرل موٹرز جاپان کے سی ای او نے مجھے جاپانی کار ہی کی قیمت میں امریکی ساختہ کیڈیلیک فلیٹ وُڈ کار کی پیشکش کی۔

کوشش۔۔۔اور اُس کا نتیجہ

میں نے کیڈیلیک فلیٹ وُڈ آزمائی۔ ناریتا ایئرپورٹ جانے اور آنے کے لیے ہائی وے کی رائڈ بہت اچھی تھی مگر ایک مسئلہ تھا۔۔۔موڑ کاٹنا بہت دشوار ہوتا تھا اور انڈر گراؤنڈ پارکنگ میں بھی بہت مشکلات پیش آتی تھیں۔ میں روپونگی میں رہتا تھا اور یہ ون وے اسٹریٹ تھی۔

جب میں نے اپنی اِس مشکل سے جی ایم جاپان کے سی ای او کو مطلع کیا تو اُنہوں نے کہا کہ وہ مجھے کیڈیلیک سیول دے کر اِس مسئلے کو عمدگی سے حل کردیں گے۔ یہ چھوٹی گاڑی تھی۔ اِس گاڑی کا ٹرنک بہت چھوٹا تھا اور اِس میں میرے اور میری بیوی کے سُوٹ کیس کے بیک وقت سمانے کی گنجائش کم تھی۔ ہمیں بیرونِ ملک سفر درپیش رہتا تھا۔ اِس کے نتیجے میں ہماری مشکل اور بڑھ گئی۔

میرے مسائل حل ہونے کے بجائے مزید بڑھ گئے۔ میں نے اس صورتحال سے جی ایم جاپان کے سی ای او اور امریکی سفیر والٹر مونڈیل کو مطلع کیا اور دوبارہ نسان سیما ہی استعمال کرنے لگا۔ بعد میں مجھے ایک ٹویوٹا لیکسس دی گئی۔ اِس کے سوا کوئی اور حل ممکن دکھائی نہ دیا۔

مجھے دی جانے والی دونوں گاڑیوں میں ایک بنیادی سہولت تھی۔ دونوں ہی گاڑیوں کا اسٹیئرنگ وھیل دائیں طرف تھا۔ جاپان میں کاریں سڑک کے دائیں طرف چلائی جاتی ہیں یعنی رائٹ ہینڈ ڈرائیونگ ہوتی ہے جبکہ مجھے دی جانے والی دونوں امریکی کاروں میں اسٹیئرنگ وھیل بائیں طرف تھا جو جاپانی ٹریفک سے میل نہیں کھاتا تھا۔

نتیجہ کیا نکلا؟

صدر ڈونلڈ ٹرمپ اب بھی شکوہ کُناں ہیں کہ امریکی کاروں کے لیے جاپان کی مارکیٹ کُھل نہیں پارہی یا کھولی نہیں جارہی۔ معاملات وہیں کے وہیں ہیں کیونکہ جاپان میں امریکی کاروں کی فروخت میں اضافہ نہیں ہورہا۔ ۲۰۲۴ء کے دوران جاپان میں ۵۳ ہزار سے زائد مرسیڈیز بینز فروخت ہوئیں جبکہ اِس کے مقابلے میں صرف ۵۱۸ شیورلیٹ فروخت ہو پائیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امریکی کاروں میں جاپانی مارکیٹ کے حالات کا سامنا کرنے کی صلاحیت پائی ہی نہیں جاتی۔

حقائق اور اعداد و شمار سے اندازہ ہوتا ہے کہ جاپان میں امریکی کاروں کی فروخت میں انتہائی کمی کا بنیادی سبب کسی بھی قسم کی تجارتی پابندیاں یا امتیازی نوعیت کی پالیسیاں نہیں بلکہ حقیقت میں امریکا کے کاریں بنانے والے ادارے جاپانی مارکیٹ کے تقاضوں کو نظرانداز کررہے ہیں۔ جاپانی جس طرح کی کاریں پسند کرتے ہیں، وہ کاریں امریکی ادارے نہیں بنارہے۔ رائٹ اور لیفٹ ہینڈ ڈرائیونگ کا خیال نہیں رکھا جارہا۔ امریکی قیادت یہ سمجھتی آئی ہے کہ سب کے لیے دنیا تبدیل ہوگی، امریکا کے لیے تبدیل نہیں ہوگی اور سب کچھ یونہی چلتا رہے گا جیسے چلتا آیا ہے۔ دنیا بدل چکی ہے اور امریکا کو بھی اب تبدیل ہونا ہی پڑے گا۔ (مترجم: محمد ابراہیم خان)

"Why are so few American cars sold in Japan?". ("The Globalist". August 14, 2025)

غزہ: 'برادر! میں نے تین دن سے کچھ نہیں کھایا'

افتخار گیلانی

حال ہی میں بھارتی جریدے 'آؤٹ لُک' نے مجھ سے فلسطین کے محبوس علاقے غزہ پر آئی نئی آفت یعنی قحط و بھوک پر رپورٹ لکھنے کی فرمائش کی۔ میں نے نوے کی دہائی کے اوائل سے شورش زدہ علاقوں سے رپورٹنگ کی ہے۔ کشمیر، شام، فلسطین، آذربائیجان۔ آرمینیا جنگ، افریقا، بھارت کے اندر نکسل واد کے متاثرہ علاقے اور کسی حد تک شمال مشرقی ریاستوں میں جنگ و شورش کو کوَر کرتے ہوئے ہمیشہ سمجھا کہ میرے دل میں وہ سختی آ گئی ہے جو اِس پیشے اور شورش کو رپورٹ کرنے کے لیے ضروری ہے۔

'آؤٹ لُک' کی اسٹوری کے لیے جب میں نے غزہ میں ایک صحافی اور مقامی سول سوسائٹی کے ساتھ وابستہ والینٹر دوست کو فون کیا، جن کے ساتھ خبروں کے حوالے سے پچھلے دو برسوں سے ایک تعلق سا بن گیا تھا، تو کئی بار میسج اور فون کرنے کے بعد جب اُنہوں نے فون اٹھایا، تو اُن کی آواز لرز رہی تھی۔ لگتا تھا کہ جیسے وہ کہیں دُور سے سرگوشیوں میں بات کر رہے تھے۔ اُن کے الفاظ تھے؛

'برادر۔۔۔ میں نے تین دن سے کچھ نہیں کھایا۔ جیسے ہی ایک روٹی ملتی ہے، آپ کو فون کروں گا'

وہ فون کبھی نہیں آیا۔ اور میں نے بھی دوبارہ فون کرنے کی ہمت نہیں کی۔

میں دیر تک ہاتھ میں فون تھامے بیٹھا رہا۔ میں سُن ہو گیا تھا۔ حیران صرف اُس کے الفاظ پر نہیں، بلکہ اُس وقار پر بھی جس کے ساتھ اُس نے وہ جملہ ادا کیا۔ اس لمحے مجھے لگا کہ میں نے گناہ کیا ہے۔ بھوکے انسان سے خبر مانگنے کا کیا حق بنتا ہے؟

اُس لمحے مجھے اتنی شرمندگی ہوئی جتنی کبھی کسی فوجی ناکے پر تلاشیاں دیتے ہوئے نہیں ہوئی ہے۔ اس ایک لمحے، میں رپورٹر نہیں رہا۔ میں ایک اَخلاقی اِنہدام کا گواہ بن گیا۔

غزہ انسان کو توڑ دیتا ہے۔ یہاں رپورٹنگ گولیوں کے زاویوں، جنگ بندیوں یا مذاکرات کے بارے میں نہیں، بلکہ بھوک کے بارے میں ہے اور پوری دنیا کے شرم کے بارے میں ہے۔

آج کا غزہ صرف بموں اور ناکہ بندیوں کی کہانی نہیں۔ یہ بھوک کی کہانی ہے۔ ایسی قحط سالی جو قحط یا آفت سے نہیں، بلکہ منصوبہ بند جبر سے پیدا کی گئی ہے۔ غزہ کے عوام کے پیٹ ہی خالی نہیں بلکہ دنیا کی روح بھی خالی ہو چکی ہے۔

اس تحریر کے لیے میں نے ۲۸ سالہ ابو رمضان سے بات کی، جو غزہ کے شہر النصر کا رہائشی ہے۔ اس کی گفتگو تلخی اور بے یقینی سے لبریز تھی۔ جب میں نے ڈَھٹائی اور انتہائی بے شرمی سے پوچھا کہ آج کیا کھاؤ گے، اُس نے جواب دیا:

افسوس کہ ابھی تک ہم یہ طے نہیں کر پائے کہ کھانا کہاں سے لائیں گے۔ ہر دن اپنی تقدیر لاتا ہے۔ کبھی باسی روٹی کا ٹکڑا، کبھی بالکل کچھ نہیں۔ کبھی تلخ زعتر میں ڈوبا ہوا نوالہ۔۔۔ وہ بھی اگر زعتر میسر ہو۔

میں نے پوچھا کہ بھوک کیسی لگتی ہے؟ وہ لمحہ بھر رُکا، پھر ایسا جواب دیا جو ہمیشہ یاد رہے گا:

یہ ایسے ہی ہے جیسے دل میں خنجر مارا جائے اور ہاتھ بندھے ہوں۔ آپ اپنے بچوں کو بھوک سے رَوتے دیکھتے ہیں اور اُنہیں کچھ دینے کا وعدہ بھی نہیں کر پاتے۔ تسلّی کا کوئی لفظ نہیں۔۔۔ بس خاموشی رہ جاتی ہے۔

جیب میں پیسے ہیں لیکن خریدنے کو کچھ نہیں۔ چولہے پر سمندر کا پانی چڑھا دیتے ہیں۔ بچے اس کو دیکھ کر سمجھتے ہیں کہ اب اور تب کھانا تیار ہو جائے گا اور اس چولہے کو دیکھ دیکھ کر سو جاتے ہیں۔

ان کا کہنا تھا کہ امریکا اور اسرائیل کی مدد سے قائم امدادی مراکز 'موت کے پھندے' ہیں۔ جب وہاں جاتے ہیں، تو بھروسا نہیں ہوتا ہے کہ واپس پیروں پر چل کر آ سکیں گے۔ 'سب جانتے ہیں کہ امدادی مراکز کے سامنے خطرات ہیں۔ یا تو آٹے کا سفید تھیلا لے کر واپس آؤ گے، یا سفید کفن میں۔ پھر بھی جانا پڑتا ہے۔ کوئی راستہ نہیں ہے۔'

غزہ میں میں بھوک سے پیدا ہونے والی بیماریوں کا علاج اب ایک بند گلی بن چکا ہے۔ ڈاکٹروں کی مہارت میں کمی نہیں ہے۔ ان کی لگن بھی مثالی ہے۔ لیکن جب مسلسل محاصرہ اور مکمل محرومی ہو، تو ڈاکٹر کیسے کسی مریض کو غذا کھانے کو لکھ سکتا ہے، جس نے ہفتوں سے کھانا نہیں دیکھا؟ ابو رمضان کہتا ہے:

'یہ سست موت ہے۔ اور ہم سب اسے اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتا دیکھ رہے ہیں۔'

پھر بھی وہ کہتا ہے، انسانوں میں بھلائی باقی ہے 'اگر کسی کے پاس روٹی کا ایک ٹکڑا بھی ہو، جو کبھی اضافی نہیں ہوتا، وہ پڑوسی کے ساتھ بانٹ لیتا ہے، اس یقین پر کہ کل وہی نیکی واپس ملے گی۔ ہم سب موت کے پھندوں کی طرف اکٹھے جاتے ہیں۔ اگر ایک شہید ہو جائے تو دوسرا آٹا دونوں گھروں کے لیے لے آتا ہے، تاکہ دونوں خاندان زندہ رہ سکیں۔' لیکن زندہ رہنے میں کیا باقی بچا ہے جب ''زندگی'' کا تصور ہی چھین لیا گیا ہو؟

ابو رمضان مجھے بتا رہے تھے:

''یہ جینا نہیں، یہ صرف بچنا ہے۔ ہر چیز بدل گئی ہے۔ چھوٹی چھوٹی عادتوں سے لے کر ہمارے باطن تک۔ جب سے بھوک نے قبضہ کیا ہے، آئینے میں دیکھنا بھی عذاب ہو گیا ہے۔ ہمارے چہرے ہمارے جیسے نہیں لگتے، بس کھوکھلے، تھکے ہوئے سائے۔''

اُس کا کہنا تھا کہ دنیا کو ابھی بھی غزہ کی اصل صورتحال کا اِدراک نہیں ہے۔ 'میڈیا کوریج کے باوجود، کوئی نہیں سمجھتا۔ اگر سمجھتے، واقعی ہمیں دیکھتے، تو یہ جنگ ایک دن بھی نہ چلتی۔'

میں نے جب پوچھا کہ دنیا کے لیے کیا پیغام ہے، تو اس کی آواز ذرا تیز ہوئی اور اس نے کہا:

بس دنیا کو کہیں کہ جاگ جاؤ۔ اس سے پہلے کہ تاریخ تم پر لعنت بھیجے۔ ایک دن تم خود ہم سے بھی بدتر حالت میں کھانے کے محتاج ہو گے۔ قیامت کے دن ہم تمہارے منہ پر گواہی دیں گے۔

'ڈاکٹرز وِدآؤٹ بارڈرز' (ایم ایس ایف) کی ایک نئی رپورٹ میں 'غزہ ہیومینٹیرین فاؤنڈیشن' (جی ایچ ایف) کو، جو امریکی و اسرائیلی سرپرستی میں چل رہا ہے، 'ظلم کی تجربہ گاہ' قرار دیا گیا ہے۔ صرف سات ہفتوں میں ان مراکز کے باہر ۱۸۰۰/ ہلاکتیں درج کی گئیں۔ ۱۰۰ کے قریب بچوں کو گولی لگی۔۔۔ بعض کو سیدھا سر یا سینے میں۔ زخمیوں کی نوعیت۔۔۔ سر میں گولیاں، سینے میں زخم۔۔۔ ثابت کرتی ہے کہ یہ حادثے نہیں۔

امدادی مراکز ہدف اور ذِلت کے میدان بن چکے ہیں، جن کی حفاظت امریکی نجی ٹھیکے دار کرتے ہیں۔ بچ جانے والے کہتے ہیں پیغام صاف ہے؛ بھوکے مرو، یا کھانے کے لیے کوشش کرتے مرو۔ ٹی وی پر امدادی ٹرکوں کی تصاویر چلتی ہیں، مگر زمین پر حقیقت مختلف ہے۔

مارچ سے، جب اسرائیل نے حماس کے ساتھ جنگ بندی مذاکرات کے دوران امداد کی ناکہ بندی کی، خِطّے کو ایک منصوبہ بند بھکمری میں جھونک دیا گیا۔ وزارتِ صحت کے مطابق اب تک کم از کم ۲۵۱/ افراد۔۔۔ جن میں ۱۰۰/ بچے شامل ہیں۔۔۔ بھوک سے مر چکے ہیں۔ غزہ کی صحافی راشا ابو جلال لکھتی ہیں کہ امدادی ٹرک بھی راستے میں لُوٹ لیے جاتے ہیں یا چند گروہوں کے قبضے میں چلے جاتے ہیں۔ غزہ کی

ضروریات کے لیے روزانہ ۵۰۰۔۶۰۰ ٹرک درکار ہیں۔ مگر اسرائیل ۱۰۰ سے بھی کم ٹرکوں کو داخلے کی اجازت دیتا ہے۔

چھ بچوں کے باپ خالد تنیرہ کہتے ہیں:

یہ امداد سب تماشا ہے۔ ایک فوجی طیارے نے سات فضائی غباروں سے آٹے کے تھیلے ہمارے محلے کے اوپر گرائے۔ ہزاروں لوگ اُن پر ٹوٹ پڑے۔۔۔ حالانکہ وہ سامان چند درجن خاندانوں کے لیے بھی کافی نہ تھا۔

صحافی ابوجلال اپنی حالت زار بتاتی ہیں کہ دو دن سے امدادی کھانے کا انتظار کرنے کے بعد انہوں نے ۲۵ ڈالر میں ایک کلو آٹا خریدا، جو مشکل سے ایک ڈالر کا ہوتا تھا۔ اب شیر خوار بچوں کا دودھ ۸۰ ڈالر فی ڈبہ ہے، جو پہلے ۱۰ ڈالر تھا۔ مائیں اپنے زیورات بیچ کر بچوں کو کھلا رہی ہیں۔

غزہ کے کالم نگار طلال اوکل لکھتے ہیں: 'جب تک امدادی رسائی بہتر نہیں ہوتی اور سکیورٹی بحال نہیں ہوتی، بھوک مزید افراد کو ہلاک کرے گی۔' بین الاقوامی فضائی ڈراپ ایک المیہ تماشا ہیں۔ 'ڈاکٹرز وِدآؤٹ بارڈرز' نے انہیں 'بے اثر اور خطرناک' بتایا ہے۔

ایک نرس نے بتایا کہ امدادی جگہوں پر ایک پانچ سالہ بچّہ ہجوم میں کچلا گیا، جس کی وجہ سے اس کا چہرہ دَم گھٹنے سے نیلا پڑ گیا تھا۔ ایک آٹھ سالہ بچّے کے سینے میں امداد لیتے ہوئے گولی لگی۔ 'ہم صرف چند زخمیوں کا علاج کر پاتے ہیں۔ یہ جنگ نہیں رہی، یہ کچھ اور ہے۔ جنگ سے بھی زیادہ مَہیب اور تاریک۔'

بیالیس سالہ خدیجہ خدیر کہتی ہیں:

میرے چار بچّے بھوک سے سِسک رہے ہیں۔ ہم تین چار روز کے بعد ایک روٹی کھاتے ہیں اور یہ غزہ میں آج کل ایک لگژری ہے۔

غزہ میں میڈیا آفس کے ڈائریکٹر جنرل ڈاکٹر اسماعیل الثوابتا کا کہنا تھا کہ قحط براہِ راست اسرائیلی فوجی محاصرے کا نتیجہ ہے۔ برسوں سے کھانے، ایندھن اور دواؤں کی منظّم پابندی اور تقسیم کے راستوں کی بار بار توڑ پھوڑ نے صورتحال بگاڑ دی ہے۔ محفوظ رسائی ناممکن ہوگئی ہے۔ خطے میں بدترین قحط شروع ہو چکا ہے۔ عالمی عدالت انصاف نے ۲۶ جنوری، ۲۸ مارچ، اور ۲۴ مئی ۲۰۲۴ء کو واضح حکم دیا کہ اسرائیل 'بِلا رُکاوٹ' انسانی امداد کی رسائی یقینی بنائے اور شہریوں کی حفاظت کرے۔ مگر اسرائیل اب بھی گزرگاہیں بند رکھتا ہے، ریلیف روکتا ہے، اور تقسیم مراکز کو نشانہ بناتا ہے۔

////// باقی صفحہ نمبر ۱۰ \\\\\\

چین کے ساتھ تعلقات: بھارتی خارجہ پالیسی کا یوٹرن

افتخار گیلانی

ایک عرصے تک ایشیا پیسفک میں مغربی مفادات کو تحفظ فراہم کرانے اور چین کا مقابلہ کرنے کا خواب سجانے کے بعد حالیہ امریکی سرد مُہری نے بھارت کی خارجہ پالیسی کو مکمل یوٹرن لینے پر مجبور کر دیا ہے۔

ایک بار پھر بھارت، چین کے ساتھ تعلقات کو استوار کر کے اپنی سرحدوں کی حفاظت کے بندوبست کرنے کے فراق میں ہے۔ دوسری طرف امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ بھارتی وزیراعظم نریندر مودی کے زخموں پر نمک پاشی کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دے رہے ہیں۔

حال ہی میں اِس ضِمن میں انہوں نے اپنے ایک قریبی معتمد سرگئی گور کو بھارت میں امریکی سفیر مقرر کرنے کا اعلان کیا ہے۔ سفیر کے ساتھ اُن کو جنوبی اور وسطی ایشیا کے لیے خصوصی ایلچی بھی نامزد کر دیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ بھارت کو دوبارہ پاکستان اور افغانستان پالیسی کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔

دوہری ذمہ داری کے باعث گورنئی دہلی اور اسلام آباد کے درمیان سفر کرتے رہیں گے اور ایک طرح سے بھارت اور پاکستان کے درمیان جس امریکی ثالثی سے مودی حکومت انکار کرتی رہی ہے، وہ اب اصل اور عملی شکل میں سامنے آجائے گی۔ ٹرمپ نے کھلے عام کہا ہے کہ گور اس خطے میں اُن کا ایجنڈا آگے بڑھائیں گے۔

امریکا کے ساتھ آئی اس سرد مُہری اور پھر یورپ سمیت مغربی ممالک کی طرف سے روسی تیل خرید کر صاف کرنے کے بعد مہنگے داموں میں بین الاقوامی مارکیٹ میں فروخت کرنے پر بھارت کی سرزنش کرنے کے بعد بھارتی وزارت خارجہ چین کے ساتھ پانچ برس کی منجمد کیفیت، جو ۲۰۲۰ء کے گلوان تصادم کے بعد پیدا ہوئی تھی، کو ازسرنو اُستوار کرنے کے لیے شدّومدّ سے کام کر رہی ہے۔

اسی سلسلے میں پچھلے دو ماہ سے مودی کی ایما پر وزیر خارجہ جے شنکر اور قومی سلامتی مشیر اجیت ڈوبھال بیجنگ کے دوروں پر گئے اور پھر ۱۸ اور ۱۹ اگست کو چینی وزیر خارجہ وانگ یی کی نئی دہلی آمد ہوئی۔

دونوں ملکوں نے سفر اور تجارت کی سہولت کی بحالی، سرحدی نظم ونسق کے طریقِ کار کی ازسرِنو تشکیل، اور بھارتی وزیراعظم نریندر مودی چینی شہر تیانجن میں شنگھائی تعاون تنظیم ایس سی او کے اجلاس میں شرکت کرنے کے علاوہ چینی صدر شی جن پنگ سے ملاقات کر رہے ہیں۔

نئی دہلی میں چینی ماہرین کا کہنا ہے کہ شی جن پنگ مودی کو خِطّے کو پُرسکون رکھنے کی تلقین کریں گے اور اِس لیے وہ اُن کو پاکستان کے ساتھ تعلقات کو معمول پر لانے اور جنگوں سے گریز کرنے کا مشورہ دیں گے، تاکہ خطے میں براہِ راست امریکی مداخلت کو روکا جائے۔ بیجنگ بھی فی الحال ہمالیہ کے محاذ کو پُرسکون رکھنا چاہتا ہے، تاکہ وہ اپنی اصل توجہ امریکا اور تائیوان کے مسئلے پر مرکوز رکھ سکے۔

بھارتی سفارت کاری کے تئیں امریکی صدر ٹرمپ جس طرح اضطراب کا مظاہرہ کر رہے ہیں، اس سے قبل چین بھی اس کا مظاہرہ کر چکا ہے۔ چاہے بین الاقوامی سفارت کاری ہو یا داخلی سیاسی مسائل، بھارت کا پورا زور ہی حالات کو اسٹیٹس کو یعنی جوں کا توں رکھنے میں لگا رہتا ہے۔

یعنی کسی کو میز پر لا کر اس کو بس مذاکرات برائے مذاکرات کرا کے اتنا تھکا دو کہ اصل مسئلہ ہی کہیں دب جائے اور فریق بس بھاگتے چور کی لنگوٹی پر ہی اکتفا کرنے پر مجبور ہو جائے۔ کشمیر میں شیخ عبداللہ، میزورم میں لال ڈنگا، پنجاب میں اکالیوں پر اس کا کامیاب تجربہ کیا گیا ہے۔ ناگالینڈ میں مودی ۲۰۱۵ء سے اس تجربہ کو دہرا رہے ہیں۔

یہی کچھ مؤقف بھارت کا بین الاقوامی محاذ پر بھی ہوتا ہے۔ ٹرمپ نے اپنی پہلی ہی مدتِ اقتدار کے دوران بھارتی حکومت کو تجارت کے توازن اور محصولات کے حوالے سے آگاہ کیا تھا۔

مودی نے اپنے امریکی دورہ کے دوران تجویز دی تھی کہ بھارت کی طرف سے اس وقت کے وزیر تجارت سریش پربھو، امریکی وزیر خزانہ اسٹیون منوچن کے ساتھ گفت وشنید کریں گے۔ منوچن کے مطابق جب پربھو واشنگٹن آکر بات چیت کرتے تھے، تو ان کا جواب ہوتا تھا کہ نئی دہلی واپس جا کر وہ اپنی سیاسی قیادت سے مشورہ کریں گے۔

پھر ہفتوں تک امریکی وزیر خزانہ کا فون ہی نہیں اٹھاتے تھے۔ پھر کسی دن دوبارہ بات چیت کی تاریخ طے کر کے پھر

واشنگٹن آتے تھے۔ یہی کرتے کرتے ٹرمپ کے چار سال نکال دیے گئے۔

چونکہ جو بائیڈن کے لیے چین کے مقابلے میں بھارت کو کھڑا کرنا ترجیحات میں تھا، اس لیے وہ بھارت کو مراعات دیتے رہے۔ بتایا جاتا ہے کہ ٹرمپ نے اس مذاکرات برائے مذاکرات کے کھیل کو سمجھ کر اس بار فروری میں ہی مودی کے ساتھ وہائٹ ہاؤس میں ہوئی ملاقات کے دوران اشاروں کنایوں میں بتایا تھا کہ وہ نتیجہ خیز مذاکرات چاہتے ہیں تاکہ تجارتی توازن جو بہت زیادہ بھارت کے حق میں ہے، اس کو ہموار کیا جا سکے۔

مگر مودی اور ان کی ٹیم اس زعم میں مبتلا تھے کہ ایشیا پیسفک میں جس طرح وہ امریکی مفادات کی نگرانی کرتے ہیں اس لیے ان کو مراعات ملتی رہیں گی اور مذاکرات پر مذاکرات کروا کے ٹرمپ کے یہ چار سال بھی نکل جائیں گے۔

اُن کو شاید اِس بات کا اِدراک نہیں تھا ایک تو ٹرمپ لین دین والے کاروباری لیڈر ہیں اور دوسرا اِس بار اُن کو مسائل کو نپٹانے میں جلدی ہے، تاکہ امریکی تاریخ میں وہ یاد کیے جائیں، کیونکہ اگلی بار وہ صدارتی انتخاب کے امیدوار نہیں ہو سکتے ہیں۔

فروری میں ٹرمپ کے اشاروں کنایوں کے بعد ۲۶ مارچ کو کیپٹل ہل میں بھارت اور امریکا کی تزویراتی شراکت پر ہوئی بریفنگ میں امریکی ایوان نمائندگان کے ۴۳۵ رارا کین میں صرف ۱۱ نے شرکت کی۔

جب سے ۱۹۹۳ء میں کانگریشنل کاکس وجود میں آیا ہے، یہ سب سے کم شرکت تھی۔ کانگریس کے اراکین کی عدم دلچسپی سے اندازہ لگایا جانا چاہیے تھا کہ تعلقات انتشار کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اس بریفنگ کا اہتمام یو ایس۔ انڈیا اسٹریٹجک پارٹنرشپ فورم نے کیا تھا۔

چند سال قبل چین کو بھی اسی طرح کی شکایت تھی کہ سفارتی سطح پر بھارت تنازعات کو سلجھانے میں دلچسپی نہیں لے رہا ہے، بلکہ مذاکرات کو طُول دے رہا ہے۔ ۱۹۸۸ء میں راجیو گاندھی نے بیجنگ جا کر نئے تعلقات کی داغ بیل ڈالی تھی۔

چینی رہنما صدر یانگ شانگ کن، وزیراعظم لی پنگ اور ملٹری کمیشن کے سربراہ دنگ زیاو پنگ اُس وقت چین کو ایک تجارتی اور مینوفیکچرنگ مرکز بنانے پر توجہ مرکوز کیے ہوتے تھے۔ اپنے اردگرد ۱۴ میں سے ۱۳ رممالک کے ساتھ چین سرحدی تنازع سلجھانے کی تگ و دَو کر رہا تھا، تاکہ اس کی پوری توجہ معاشی معاملات کی طرف مرکوز رہے۔ صرف بھارت واحد ملک تھا، جس کے ساتھ سرحدی تنازعات کے سلسلے میں کوئی میکانزم موجود نہیں تھا۔

راجیو گاندھی کے دورہ کے دوران سرحدی تنازعات کو سلجھانے کے لیے دونوں ملکوں کے خارجہ دفاتر میں مشترکہ ورکنگ گروپ تشکیل دیے گئے۔ سال ۱۹۹۳ء میں بھارتی وزیراعظم نرسہا راؤ نے اس سَعی کو اور آگے لے جا کر سرحدوں کو پُرامن رکھنے کے ایک معاہدہ پر دستخط کیے۔ اس کے مطابق دونوں ملکوں کی فوجی پارٹیاں ہتھیاروں کے بغیر پیٹرولنگ کر کے واپس اپنے کیمپوں میں چلی جائیں گی اور متنازع علاقوں میں جانے سے قبل ایک دوسرے کو مطلع کریں گی۔

اس کے علاوہ ان علاقوں میں کوئی انفرااسٹرکچر کھڑا نہیں کیا جائے گا۔ ۲۰۰۳ء میں چین نے شکایت کی کہ خارجہ دفاتر کے ورکنگ گروپ تنازع کو سلجھانے کے سلسلے میں کوئی پیشرفت نہیں کر رہے ہیں۔

وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی کی بیجنگ آمد پر دونوں ملکوں نے اتفاق کیا کہ اس مسئلے کو دفترِ خارجہ سے لے کر بھارتی وزیراعظم اور چینی صدر کے قریبی معتمدوں کے حوالے کیا جائے۔ اس طرح خصوصی نمائندوں کا تقرر ہوا۔

بھارت کی طرف سے طے ہوا کہ قومی سلامتی مشیر، چونکہ ہمہ وقت وزیراعظم کے رابطہ میں رہتا ہے، وہ چینی ہم منصبوں کے ساتھ گفت وشنید کرے گا۔ ابھی تک دونوں ملکوں کے خصوصی نمائندوں نے ۵۰ اَدوار کے مذاکرات کیے ہیں۔

سابق قومی سلامتی مشیر شیوشنکر مینن نے راقم کو ایک بار بتایا کہ خصوصی نمائندوں کا رول اب ختم ہو چکا ہے۔ مینن، جنہوں نے پانچ سال تک یہ فریضہ انجام دیا، کا کہنا تھا کہ انہوں نے اپنے چینی ہم منصب دائی بنگو کے ساتھ مل کر لو اور دو کے فارمولہ کے تحت ایک حل ترتیب دیا تھا، جو سیاسی قیادت کی بصیرت اور جرأت کا منتظر ہے۔

دائی بنگو نے اپنے منصب سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد ایک چینی جرنل میں لکھا تھا کہ انہوں نے تجویز دی تھی کہ گراؤنڈ پوزیشن کا احترام کرتے ہوئے، دونوں ممالک یعنی بھارت لدّاخ میں اکسائی چن پر اور چین شمال مشرق میں ارونا چل پردیش پر دعویٰ واپس لے لیں اور پھر باقی سیکٹرز میں جو بارڈر پر تقریباً پانچ کلومیٹر کا تفاوت ہے، اس کو بھی مختلف سیکٹرز میں لو اور دو کے اصول کے تحت حل کر لیں۔

مگر بھارت کی طرف سے اس تجویز کا کوئی جواب نہیں آیا اور وہ ہر سال خصوصی نمائندوں کی میٹنگ کبھی بیجنگ اور کبھی دہلی میں طلب کرتا ہے۔

چینی فارن آفس کی دعوت پر دہلی میں کام کرنے والے تین صحافیوں نے ۲۰۱۶ء میں تبّت کا ایک تفصیلی دورہ کیا تھا۔ میں بھی اُس وفد میں شامل تھا۔ تبت اور ینان صوبہ کے شنگریلا علاقے سے واپسی پر بیجنگ میں چینی وزارت خارجہ کے سینئر افسران نے ہمیں بریفنگ میں بتایا کہ ان کا ملک مذاکرات برائے مذاکرات کا قائل نہیں ہے۔

اگر مذاکرات حل کی طرف گامزن نہ ہوں، تو وہ وقت اور قومی وسائل برباد نہیں کر سکتے ہیں۔ یعنی ہمارے ذریعے ایک براہ راست وارننگ پہنچائی گئی تھی کہ مذاکرات کے سلسلے میں چین کی قوتِ برداشت جواب دے رہی ہے۔ اس کے بعد ہی سرحد پر کشیدگی اور جھڑپوں کی وارداتیں پیش آئیں۔

خیر ابھی چینی وزیر خارجہ کے دورہ کے دوران اب طے پایا کہ سرحدی تنازع پر خصوصی نمائندوں کی بات چیت بحال کی جائے، تکنیکی حل کے لیے ماہرین کا گروپ بنایا جائے اور مشرقی و درمیانی سیکٹرز میں سرحدی تنازع کو سلجھانے کے لیے نئے سطح کے طریقِ کار تشکیل دیے جائیں۔

بھارتی یاتریوں کے لیے تبّت میں کیلاش مانسرووَر یاترا کی بحالی کا اعلان بھی کیا گیا۔ براہِ راست پروازیں اور چینی سیاحوں و صحافیوں کے ویزے دوبارہ جاری ہوں گے۔ لپولیکھ، شپکی لا اور ناتھولا پر سرحدی تجارتی مراکز دوبارہ کھولے جائیں گے۔ چین نے نایاب معدنیات، کھادوں اور سرنگ کھودنے والی مشینوں پر عائد پابندیاں نرم کرنے کا وعدہ کیا جو بھارتی صنعت کے لیے رکاوٹ بنی ہوئی تھیں۔

بیجنگ نے بین السری آبی گزرگاہوں خصوصاً برہم پتر کے بارے میں ہنگامی صورتحال میں ہائیڈرولوجیکل ڈیٹا فراہم کرنے پر رضامندی ظاہر کی۔ بیجنگ نے دعویٰ کیا کہ جےشنکر نے اعادہ کیا کہ 'تائیوان چین کا حصہ ہے۔' مگر بھارت نے بعد میں وضاحت کی کہ اس کے مؤقف میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ نئی دہلی ایک چین پالیسی کو تسلیم کرتا ہے لیکن تائیوان سے اقتصادی، ثقافتی اور ٹکنالوجی تعلقات برقرار رکھے گا۔ یعنی ایک گول مول سی وضاحت تھی، مگر چینی وزارت خارجہ نے اس وضاحت پر ناراضی جتاتے ہوئے کہا کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی، جب بھارتی وزیر خارجہ نے بند کمرے میں دوطرفہ ملاقات کے دوران بتایا تھا کہ ان کا ملک تائیوان کو چین کا حصہ سمجھتا ہے۔

تزویراتی حساب کتاب کے مطابق چین نہیں چاہتا کہ

اس کی سرحدوں پر فی الحال کوئی ہلچل ہو۔ تاکہ وہ بحرالکاہل میں امریکا کے ساتھ کسی ممکنہ فوجی تصادم کے لیے تیار رہے۔ چین بھارت کے ساتھ صلح آمیز تعلقات پر آمادہ رہا، مگر سمجھتا ہے کہ نئی دہلی امریکی اثر کے تحت پانی گدلا کر رہا ہے۔ بھارت نے ہمیشہ اپنی ایشیا پیسفک حکمتِ عملی کے مرکز میں امریکا کو رکھا تھا۔ مگر یہ داؤ ناکام ہوا ہے۔

ٹرمپ نے اپنے پہلے دور میں ٹرانس پیسفک پارٹنرشپ معاہدہ یعنی ٹی پی پی سے نکل کر امریکا کے ایشیا جھکاؤ کو کھوکھلا کر دیا تھا۔ دوسرے دَور میں بھی ٹرمپ نے چین کے مقابلے میں ایشیا پیسفک اتحاد کو سنبھالنے میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔ اب ایک طرف چین جیسا طاقتور ہمسایہ جس سے تعلقات کشیدہ ہیں، دوسری طرف امریکا کی عدم توجہی نے بھارتی خارجہ پالیسی کی پول کھول کر رکھ دی۔

بھارت بھی فی الحال چین کے ساتھ براہِ راست تصادم کو ٹالنا چاہتا ہے، تاآنکہ وہ دو محاذوں پر لڑنے کے قابل ہو جائے۔ بھارت میں یہ احساس اب گھر کر گیا ہے، کہ وہ اب صرف واشنگٹن پر بھروسا نہیں کرسکتا۔

مالی سال ۲۵۔۲۰۲۴ء میں بھارت کا چین کے ساتھ تجارتی خسارہ ۹۹٫۲ ارب ڈالر تک پہنچ گیا ہے، جس میں الیکٹرانکس، بیٹریوں اور کیمیکلز پر شدید انحصار ہے۔ دونوں نے بنیادی تنازعات طَرک نہیں کیے، لیکن دونوں سمجھتے ہیں کہ فی الحال تصادم کسی کے بھی مفاد میں نہیں ہے۔ وانگ نے بھی تسلیم کیا کہ 'پچھلے چند برس میں جو رکاوٹیں آئیں، وہ ہمارے مفاد میں نہیں تھیں۔'

معروف بھارتی تجزیہ کار بھارت بھوشن کے مطابق امریکا کے سہارے عظمت کے خواب دیکھنے والا بھارت اس وقت تذبذب کی کیفیت میں مبتلا ہے۔ اس لیے خارجہ پالیسی کو ازسرِنو ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ بھارتی سیاسی قیادت اندھی وفاداری کو اپنی خوبی سمجھتی ہے۔ امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی جانب سے بھارت پر عائد کیے گئے تجارتی جرمانوں نے بھارتی وزرا اور اہلکاروں کو ماسکو اور بیجنگ کی طرف دوڑنے پر مجبور کر دیا ہے، مگر وہ اس کو 'اسٹریٹجک چابک دستی' کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔ مگر ماسکو اور بیجنگ اس چابک دستی کو بھارت کی مجبوری گردانتے ہیں اور اس کی پوری وصولی کریں گے۔ کل تک بھارتی حکومت چینی مصنوعات کے بائیکاٹ کی کال دے رہی تھی، چین کو اسٹریٹجک خطرہ کے بطور پیش کیا جا رہا تھا۔ اب وہی قیادت اس کو شراکت دار بنا کر پیش کر رہے ہیں۔

چین کو پہلے ہی بھارت کی کمزور اسٹریٹجک بصیرت کا اِدراک تھا۔ اسے یہ بھی بخوبی اندازہ تھا کہ بھارت کی قیادت دعووں سے زیادہ عمل میں کمزور ہے۔ یہی کمزوری اس وقت کُھل کر سامنے آئی جب بھارت نے لدّاخ میں ۲۰۲۰ء کی چینی دراندازیوں کو تسلیم کرنے سے بھی گُریز کیا۔

اصل ناکامی مگر اُن مشیروں کی ہے جنھوں نے مودی کو یقین دلایا کہ بھارت کی عظمت کا راستہ خطے کے مسائل کو حل کرنے اور امن قائم کرنے کے بجائے واشنگٹن سے ہو کر گزرتا ہے۔ انہی کے دباؤ پر بھارت نے امریکا کے ساتھ 'کواڈ'، دفاعی معاہدے اور بحرالکاہل حکمتِ عملی میں شمولیت اختیار کی۔ لیکن یہ سب بھارت کو امریکی معاشی دباؤ سے نہ بچا سکے۔ اس یکطرفہ جھکاؤ نے دوسرے تعلقات کو نظرانداز کر دیا۔

سرحدی تنازع کے حوالے سے بتایا گیا کہ چین نے اپنی تجویز کو دہرایا کہ پہلے سکّم سیکٹر کا قضیہ حل کیا جائے، کیونکہ یہ سب سے کم متنازع ہے۔ وہ ۱۸۹۰ء میں سکّم کی ریاست اور چین کی چنگ سلطنت کے درمیان ہوئے معاہدہ کو لاگو کر کے اس کی توثیق چاہتا ہے۔

اس کے لیے خصوصی نمائندوں کا میکنزم بنایا گیا ہے، جو معاہدوں کی مختلف شِقوں کی وضاحت کریں گے۔ پہلی بار ۲۰۱۷ء میں بھارت میں اُس وقت کے چینی سفیر لووژاہوئی نے نئی دہلی میں ایک تھنک ٹینک کے اجلاس کے دوران سکّم سیکٹر کو ترجیحی بنیاد پر حل کرنے کی تجویز دی تھی، مگر اس کے چند ماہ بعد ہی دوکلم تنازع شروع ہوا اور بھارتی فوجی سکّم سے بھوٹان میں داخل ہو گئے تھے تاکہ چین کو جمفیری رِج کی طرف سڑک بنانے سے روک سکیں۔ اس سے سکّم کی سرحد کو باقی تین متنازع بھارت۔ چین سرحدی حصوں یعنی مغربی، درمیانی اور مشرقی حصوں سے الگ کر دیا جائے گا۔

ذرائع کے مطابق چین نے یہ تجاویز پھر باقاعدہ طور پر اگست ۲۰۱۹ء میں بیجنگ میں وزیرِ خارجہ ایس جےشنکر سے وانگ یی کی ملاقات کے دوران پیش کی تھی۔ بھارت میں اس کو ایک اسٹریٹجک جال کے طور پر دیکھا گیا۔ مودی حکومت کے قریبی سابق بھارتی خارجہ سکریٹری کنول سبّل کے مطابق یہ تجویز ۲۰۰۵ء کے اُس معاہدے کی خلاف ورزی ہے جس میں سرحدی تنازع کے حل کے رہنما اصول طے کیے گئے تھے اور جس میں واضح لکھا ہے کہ یہ ایک پیکیج ڈیل ہوگی۔ بھارتی تجزیہ کاروں کے مطابق کہ سکّم سیکٹر کے حل ہونے کے بعد چین بھوٹان کے ساتھ اپنی سرحد طے کر کے دوکلم کے پہاڑی خطوں کو ضم کرے گا۔

بھارت کے ایک سابق آرمی چیف کا کہنا ہے کہ اگر بھارت سکّم کا معاملہ طے کر دیتا ہے، جہاں وہ چمبی ویلی اور شمال میں فنگر ایریا پر حاوی ہے، تو چین اپنی چمبی ویلی کی حدود کو بڑھائے گا اور مغربی بنگال کے سلیگُڑی کاریڈور پر دباؤ بڑھائے گا، جو شمال مشرقی ریاستوں کے ساتھ واحد زمینی لنک ہے۔ اس کا اثر بھارت۔ چین۔ بھوٹان کے سہ سرحدی مقام باتانگ لا پر پڑے گا، اور چین ممکنہ طور پر جمفیری رِج تک اپنی رسائی بڑھا لے گا، جہاں سے پورا سلیگُڑی کاریڈور اس کی دسترس میں ہوگا۔

کئی برسوں کی مزاحمت کے بعد ۱۹/اگست ۲۰۲۵ء کو بھارتی وزارتِ خارجہ نے اتفاق کر لیا ہے کہ ورکنگ میکنزم برائے مشاورت و رابطہ (ڈبلیو ایم سی سی) کے تحت ایک ماہرین کا گروپ تشکیل دیا جائے گا جو بھارت۔ چین سرحد کے حصوں کا جائزہ لے گا۔ بھارتی وزیراعظم مودی سے وانگ یی کی ملاقات کے بعد جاری ہونے والے چینی بیان میں کہا گیا کہ سرحدی مسئلے پر نیا اتفاق رائے ہوا ہے۔۔۔ اور اُن حصوں میں سرحدی مذاکرات شروع کرنے پر بات ہوئی ہے جہاں حالات سازگار ہیں۔

یہ معاہدہ اُس وقت ہوا ہے جب چین اپنی سرحدی بنیادی ڈھانچے اور فوجی صلاحیتوں کو مسلسل مضبوط کر رہا ہے۔ پیپلز لبریشن آرمی (پی ایل اے) دوکلم کے پہاڑی علاقے میں مضبوطی سے جم چکی ہے اور جمفیری رِج تک پہنچنے کے متبادل راستے تلاش کر چکی ہے۔ اب یہ بھارت کی دوراندیشی ہے یا سفارتی ہزیمت، وقت ہی اس کا فیصلہ کرے گا۔

ویسے بھی چین کے موجودہ وزیرِ خارجہ کو وانگ یی کو مغربی تجزیہ نگار 'سلور فاکس' یا 'چاندی کی لومڑی' کہتے ہیں، کیونکہ وہ ایک ایسے سیاستدان ہیں، جو نرم لہجے اور صبرآزما حکمت عملی کے ذریعے مخالف کو تھکاتا ہے، اور بالآخر اپنی شرائط منواتا ہے۔

ان کی سفارت کاری کا انداز زیادہ تر رسمی اور بیورو کریٹک دکھائی دیتا ہے، لیکن ان کے پیچھے کئی دہائیوں کا تجربہ ہے۔ ان کو ایک محتاط مگر سخت گیر سفارتکار سمجھا جاتا ہے۔ ان کا مشہور جملہ ہے 'بیجنگ کا طریقہ کار یہ ہے کہ نرم لہجے میں سخت مؤقف اختیار کیا جائے۔' وہ اکثر اپنی حکمت عملی کو ایک کہاوت کے ذریعے بیان کرتے ہیں: 'جب ہم کہتے ہیں کہ ایک بات دوبار دہرائی جائے تو اس کا مطلب ہے کہ ہم اسے دوبار عمل میں لائیں گے۔'

(بحوالہ: ''دی وائر اردو ڈاٹ کام''۔ ۲۷/اگست ۲۰۲۵ء)

'نارمل ریاست' کے پہلو میں 'فلسطینی ریاست' کی باتیں

منصور جعفر

اسرائیل کے لیے امریکا ایک طویل عرصے سے کوشاں ہے کہ اسے عرب مملکتیں بشمول اسلامی ممالک ایک 'نارمل ریاست' کے طور پر تسلیم کرلیں، تاکہ اسرائیلی ریاست کے لیے عرب وعجم کے وہ سارے دروازے بھی کھل جائیں جو ابھی تک بند چلے آرہے ہیں۔

کچھ عرصے سے ان امریکی کوششوں کا محور ابراہم معاہدات ہیں۔ ظاہری علامات کافی حد تک کامیابی کی نوید سنا رہی ہیں، تاہم اب تک اس سلسلے میں بڑی رکاوٹ سعودی عرب کو کہا جاتا رہا ہے کہ جب تک سعودی عرب اسرائیل کو تسلیم نہیں کرے گا، بڑا سنگِ میل عبور نہیں ہوگا۔

سعودی عرب کی فرانس کے ساتھ مل کر نیویارک میں کی گئی حالیہ فلسطین کانفرنس علاقائی امن کے لیے اس کے خلوص کا مظہر تھی، جس میں فلسطینی ریاست کے قیام کی صورت میں اسرائیلی ریاست تسلیم کرنے کا مشروط عندیہ بھی دیا گیا۔

جولائی کے اواخر میں اقوام متحدہ کی میزبانی میں یہ دو روزہ کانفرنس ایک اہم موڑ تھی مگر اسرائیل وامریکا کا اس کے بارے میں رویہ توہین آمیز محسوس ہوا۔

اگرچہ اسرائیل کسی بھی صورت ایک نارمل ریاست نہیں ہے۔ اس کے قیام سے لے کر اس کی ساری تاریخ تک اور پچھلے تقریباً دو برسوں سے غزہ میں اسرائیلی ریاست کی خوفناک جنگ اس امر کی غیر معمولی گواہیاں ہیں۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد نئے عالمی نظام میں قومی ریاستوں کی تخلیق کے تناظر میں بھی اسرائیلی ریاست پر کئی سوال موجود ہیں۔ اسرائیل کے شہری قرار پانے والوں کے آبا واجداد صدیوں سے یورپ وامریکا وغیرہ کے باسی تھے، لیکن انہیں ایک اسرائیلی ریاست کے لیے بھرتی کے مال کے طور پر دور دراز کے ملکوں سے گھیر گھار کر مشرق وسطیٰ لایا گیا۔

ان میں جرمن قوم سے لے کر روسی قوم کے نمائندہ افراد، امریکی، برطانوی، آسٹرین، فرانسیسیوں سمیت تقریباً سبھی یورپی اقوام سے تعلق رکھنے والے یورپی لوگ شامل تھے، جنہیں ایک اسرائیلی قوم بنانے کی غیر حقیقت پسندانہ کوشش کی گئی۔

بعض لوگ غلط تجزیے کی بنیاد پر اسرائیلی ریاست کی تخلیق کو پاکستان سے ملاتے ہیں، مگر یہ درست مثال نہیں۔ پاکستان دوقومی نظریے کی بنیاد پر وجود میں آیا تھا۔ ہندوستان میں صدیوں سے اکٹھی رہنے والی دو اقوام کی بنیاد پر پاکستان اور بھارت، دونوں کا قیام عمل میں آیا تھا۔ بعد ازاں دونوں ملک اور اقوام ہر معاملے میں ایک دوسرے سے مختلف قرار پائیں۔ بھارت کے شہری بن جانے والے لوگ پاکستان کے شہری نہ رہے اور پاکستان کی شہریت اختیار کرنے والے بھارتی شہری نہ رہ سکے۔

جبکہ اسرائیل میں رنگ برنگے قومی پس منظر رکھنے والے لوگ آج اسرائیل کے بھی شہری ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ امریکا، برطانیہ، فرانس، جرمنی، روس، سویڈن، آسٹریا، اٹلی، اسپین وغیرہ کے بھی شہری ہیں۔

پاکستان اور بھارت کی تقسیم پُرامن اور جمہوری انداز میں ہوئی، جبکہ اسرائیل کا وجود ممکن بنانے میں تسلط، قبضے اور دہشت گردی بنیادی عوامل رہے۔ اسرائیلی ریاست کی فوج آج بھی ان یہودی دہشت گرد تنظیموں کی یادگار ہے۔

نیز آج بھی دیگر ملکوں سے یہاں لاکر بسائے گئے لاکھوں اسرائیلی فلسطینیوں کی سرزمین پر قابض ہیں اور اسرائیل کا فلسطین کے بہت سے حصوں پر قبضہ آج بھی تنازع کی بنیاد ہے۔

اسرائیل ان معنوں میں بھی نارمل ریاست نہیں کہ امریکا اور اس کے اتحادیوں کی کاوش میں تخلیق پانے والے عالمی ادارے اقوام متحدہ کی قرارداد کا بھی اسرائیل کے قیام میں دخل ہے۔

لیکن اسرائیلی ریاست اقوام متحدہ کی بہت سی قراردادوں، اس کے اہم اداروں کی منکر ہے۔ اقوام متحدہ کے اداروں میں بین الاقوامی عدالتیں، جوہری پروگراموں کی مانیٹرنگ کے ادارے 'آئی اے ای اے' ہی نہیں، اقوام متحدہ کے انسانی حقوق اور امدادی ادارے بھی اسرائیل کو قبول نہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ جن فلسطینیوں کی سرزمین پر قبضہ کرکے مغربی ممالک اسرائیل کو عدم سے وجود میں لائے، اسرائیل ان فلسطینیوں کو ان کی آبا واجداد کی زمین پر بھی برداشت کرنے اور فلسطینی ریاست کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔

اس کے باوجود اسرائیل کو کئی ملکوں سے تسلیم کروالیا گیا ہے اور مزید کئی کو تقریباً راضی کرلیا گیا ہے، مگر اسرائیلی ریاست فلسطینی ریاست کا قیام قبول کرنے کو بھی آمادہ نہیں۔ حتیٰ کہ غزہ کا محاصرہ اور فلسطینیوں کی نسل کشی ختم کرنے کو بھی تیار نہیں۔

مزید یہ کہ اسرائیلی ریاست نے غزہ پر کنٹرول وسیع کرنے کے لیے ایک نئے وسیع تر جنگی منصوبے کا اعلان کردیا ہے تاکہ مزاحمت کی سرخیل فلسطینی تنظیم حماس کا خاتمہ کرسکے، اسرائیلی قیدی رہا کروائے اور غزہ پر فلسطینیوں کی ایسی حکومت قائم کرنے کی کوشش کرے، جس کا حماس سے کوئی تعلق نہ ہو۔ نیز سلامتی کے حوالے سے اسرائیل کے لیے چیلنج نہ بن سکے۔

اسرائیلی ریاست کا یہ فیصلہ بلاجواز ہونے کے لیے کافی ہے کہ اس کی دنیا بھر میں بھی مذمت جاری ہے اور خود اسرائیل کے اندر سے بھی اس کے خلاف آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ اسرائیلی وزیراعظم جو بین الاقوامی فوجداری عدالت کو پچھلے سال ماہ مئی سے جنگی جرائم میں مطلوب ہیں۔ وہ عجلت میں ہیں کہ عدالتی فیصلوں سے پہلے غزہ کو فلسطینیوں سے 'پاک' کرسکیں۔

انہوں نے اپنی مٹھی بھر سکیورٹی کابینہ سے یہ فیصلہ اُس وقت کروایا ہے، جب اسرائیلی پارلیمنٹ سالانہ تعطیلات پر ہے اور اسرائیل کی اعلیٰ عدالتیں بھی چھٹی پر ہیں۔ یوں بغیر کسی مباحثے اور رکاوٹ کے نیتن یاہو نے اپنی جنگی ہوس کو ایک منصوبے میں ڈھال دیا ہے۔ حالانکہ پچھلے ماہ ہی وہ 'امن کے ایک کھلاڑی' کے طور پر صدر ٹرمپ کے لیے امن کے نوبیل انعام کی سفارش کرتے پائے گئے۔

نیتن یاہو کے اس نئے جنگی منصوبے کی اسرائیلی فوج کے سربراہ ایال زمیر بھی مخالفت کرچکے ہیں۔ اسرائیلی اپوزیشن اس منصوبے کو اسرائیل کے لیے بھی خطرناک بتا رہی ہے۔ نیز یہ کہ جنگ کے اس نئے منصوبے کے اعلان کے اگلے ہی روز ہزاروں اسرائیلی تل ابیب میں نئے جنگی منصوبے اور غزہ جنگ کے خلاف جبکہ جنگ بندی معاہدے کے حق میں سڑکوں پر تھے۔

اسرائیلی فوج کے 'ریزروز' میں بھی غزہ جنگ سے اکتاہٹ، تھکاوٹ اور بیزاری اب ناراضی اور جنگ میں شرکت سے انکار میں بدل رہی ہے۔

لیکن نیتن یاہو اس جنگ کو مزید کئی ماہ تک پھیلانے اور فلسطینیوں کو ان کی سرزمین سے لاکھوں کی تعداد میں کسی دوسرے ملک میں دھکیلنے کو بے تاب ہیں۔

اس سلسلے میں لیبیا کے مدار المہام فیلڈ مارشل خلیفہ حفتر کے حوالے سے بتایا جارہا ہے کہ وہ کم از کم آٹھ لاکھ فلسطینیوں کو امریکی فرمائش پر لیبیا میں رکھنے کو تیار ہیں۔

۸۱ سالہ فیلڈ مارشل خلیفہ حفتر، چند ہفتے پہلے جن کی

میزبانی کی سعادت پاکستان کو بھی حاصل ہوئی ہے، کے بارے میں معروف ہے کہ وہ امریکا کو بہت عزیز ہیں۔ اتفاق سے وہ لیبیا کی فوج کے سربراہ ہونے کے ساتھ ساتھ امریکی شہریت کا اعزاز بھی رکھتے ہیں۔

صدر ٹرمپ اور نیتن یاہو نے اسرائیلی ریاست کے نئے جنگی منصوبے پر بین الاقوامی سطح سے آنے والے ردعمل کے بعد باہم راز و نیاز بھی کرلیے ہیں۔ امریکی نمائندہ خصوصی برائے مشرق وسطیٰ اسٹیو وٹکوف نے بھی پچھلے ہی دنوں نئی منصوبہ بندی پر تبادلۂ خیال کرلیا تھا۔

اس منصوبے کے مخالفین کے لیے اسرائیلی ریاست کا غضب کس قدر زیادہ ہوسکتا ہے، اس کا اندازہ فلسطینی ریاست کو تسلیم کرنے کے لیے ماہِ ستمبر کا تعین کرنے والے فرانسیسی صدر میکرون کو اسرائیلی یہودی مذہبی پیشوا (ربی) ڈینیل ڈیوڈ کی طرف سے ملنے والی قتل کی دھمکی سے کیا جاسکتا ہے۔ ربی نے صدر میکرون کو ایک وڈیو میں کہا ہے 'تمہارے لیے اب یہی بہتر ہے کہ اپنا تابوت خود تیار کرلو'۔

کوئی نارمل ریاست ایسی ہوسکتی ہے کہ اس کا ایک مذہبی پیشوا یورپی یونین کے ایک بڑے ملک کے سربراہ کو اس طرح قتل کی دھمکی دے اور وہ ریاست دہشت گردی کے زمرے میں نہ آئے یا دنیا میں بدنامی کی لمبی مہم کی زد میں نہ آئے؟

اس نارمل ریاست کے طور پر وجود میں نہ آنے والے اسرائیل کی حیثیت مافیاز کو 'بلیک منی' سے حاصل ہونے والی دولت کی ہے، جسے وہ بعدازاں غیرقانونی منی لانڈرنگ کے ذریعے 'وائٹ منی' میں تبدیل کروانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایک بڑا واقعہ الازہر یونیورسٹی کے مفتی اعظم ڈاکٹر احمد الطیب کا غزہ جنگ کے پس منظر میں دیے گئے نفیر عام کا فتویٰ روکنے سے سامنے آیا ہے۔ اس فتوے کو عام ہونے سے پہلے ہی واپس کروا دیا گیا اور کئی مملکتوں میں ہلچل پیدا ہونے کا پیشگی سدباب ہوگیا۔ مصری حکومت پہلے ہی اپنے سفارت خانوں پر حملوں کے ممکنہ خطرات سے نمٹ رہی ہے۔

یہ صورتحال اس کے باوجود درپیش ہے کہ حماس نے شروع سے ہی اپنی جدوجہد کا دائرہ غزہ اور مقبوضہ فلسطینی علاقوں کے اندر تک محدود رکھنے کا اعلان کر رکھا ہے۔ حماس کا دہائیوں پہلے کیا گیا یہ فیصلہ کسی بھی وجہ سے ہو مگر یہ آج بھی بین الاقوامی سطح پر امن کے حق میں ہے۔

ان حالات میں امریکا کو چاہیے کہ وہ مشرق وسطیٰ کے ملکوں پر دباؤ اور بوجھ کو اس حد تک نہ بڑھائے کہ ان کی ہمت جواب دے جائے۔ تسلیم و رضا اور تعاون ایک حد تک ہی ہوسکتا ہے۔ ہلاکت خیز غزہ جنگ طویل ترین ہوچکی ہے۔

امریکا جس ریاست کو نارمل ثابت کرنے کی کوشش میں ہے، اس کا ہر اقدام اس کے ایک 'ابنارمل ریاست' ہونے کا تاثر گہرا کر رہا ہے۔ ایک ایسی ریاست جو خطے میں مسلح پولیس کے طور پر برتاؤ کرنے کا رجحان رکھتی ہے۔ اس کے حوالے سے پہلے ہی عوامی سطح پر مختلف ملکوں کو مشکلات کا اندیشہ ہے کہ اسے تسلیم کرنا فلسطینیوں کی نسل کشی اور غزہ کی تباہی و قبضے کے بدلے میں اسرائیل کو سندِ امتیاز دینے کے مترادف ہوگا۔

فلسطینی مقتدرہ سے لے کر سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، مصر، قطر، ترکی، لیبیا اور پاکستان ہی نہیں، مغربی دنیا بھی اسرائیلی ریاست کے نئے جنگی منصوبے کی مذمت کر رہی ہے۔ آسٹریلیا، کینیڈا، نیوزی لینڈ حتیٰ کہ مالٹا تک نے تو اس نئے منصوبے کے جلو میں ہی فلسطینی ریاست کو تسلیم کرنے کا عندیہ دیا ہے۔ آخر کب تک تباہ حال لیبیا کے فیلڈ مارشل اپنی عوام کی منشا کے برعکس وعدے کرتے اور زبان دیتے رہیں گے۔

خلیفہ حفتر بطور فیلڈ مارشل کتنے بھی طاقتور ہوں یا انہیں تیل کے کتنے ہی ذخائر کی نوید مل گئی ہو، وہ اپنے عوام کی منشا کو حد سے زیادہ کچل کر لاکھوں فلسطینیوں کے غزہ سے انخلا میں اپنے کاندھے پیش نہیں کرسکیں گے۔

فلسطینیوں کے بغیر فلسطین جس کے بھی سپرد کیا جائے گا، وہ اسے زیادہ دیر سنبھال نہیں سکے گا بلکہ اس کا اپنا سنبھلنا مشکل ہوسکتا ہے۔ اس لیے لازم ہے کہ اسرائیل کا نیا جنگی منصوبہ روکا جائے اور فوری جنگ بندی اور انسانی امداد کی بلا روک ترسیل کی سبیل پیدا کی جائے۔

(بحوالہ: انڈی پنڈنٹ اردو ڈاٹ کام'، ۱۴؍اگست ۲۰۲۵ء)

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی کی پیشکش
اَلْقُدُس
پس منظر اور صہیونی عزائم
سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
قیمت: ۶۰ روپے
اکیڈمی بک سینٹر فون: 021-36368020

بقیہ: 'برادر! میں نے تین دن سے کچھ نہیں کھایا'

میں نے ان سے سوال کیا کہ مغربی حکومتوں کا کیا کردار رہا ہے، تو فلسطینی رہنما کا کہنا تھا کہ زیادہ تر نے اسرائیل کو عسکری وسیاسی سہارا دیا، یا قانونی ذمہ داریوں پر عمل نہیں کیا۔ اس سے رکاوٹیں قائم رہیں۔ انہوں نے نہ تو ''ڈی کنفلکشن'' درست کیا، نہ ہی گزرگاہیں کھولیں، نہ ہی عدالتی احکام منوائے۔

میں نے اسماعیل الثوابتا سے پوچھا کہ آپ کے گھرانے نے آج اور اس ہفتے کیا کھایا؟ ان کا کہنا تھا کہ کئی روز کے بعد آج ان کو دال کا سوپ نصیب ہوا ہے۔ چند روز قبل تھوڑے سے چاول پانی کے ساتھ حلق سے اتارے تھے۔

ان کا کہنا ہے کہ یہ ان کی زندگی کا بھی سب سے کڑا لمحہ ہے۔ گھر میں بیٹی روٹی مانگتی ہے اور وہ اس کو دینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ امدادی مراکز پر اسرائیلی اکثر سر، گردن اور ٹانگوں میں گولیاں مارتے ہیں۔ لوگ تھوڑی چیزیں بانٹتے ہیں۔ ایک کلو پھلیاں دس لٹر پانی میں ابال کر کئی گھروں میں بانٹ دی جاتی ہیں۔ یہ یکجہتی ابھی باقی ہے، محاصرے اور روزانہ ہلاکتوں کے باوجود لوگ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ فلسطینی لیڈر نے بتایا کہ انہوں نے پچھلے دو ماہ میں ۱۶ کلو وزن کھو دیا۔ میرے کزنز مازن نے ۵۱ کلو، اور ماہر نے ۴۶ کلو وزن کھو دیا ہے۔

بھوک کو ہتھیار بنایا گیا ہے۔ فلسطینی اب اس ذلت پر مجبور ہیں کہ اسرائیلی ٹرک ان کی اپنی زمین پر روٹیاں لائیں اور ان کو بھوکی آبادی کے سامنے پھینک کر ان کا تماشہ دیکھے۔ اس دوران کسی فوجی کا دل چاہا تو فائرنگ شروع کردیتا ہے۔ اتنی تذلیل کیسے کوئی قوم برداشت کرسکتی ہے۔

بطور صحافی میرا قلم رُک جاتا ہے۔ بھوک نے الفاظ چھین لیے ہیں۔ میں کیا لکھوں جو اس باپ کے دکھ کا مداوا ہو جو اپنے بچے کو سُوکھتے ہوئے دیکھ کر کڑھتا ہے۔ وہ ماں جس نے پانی کا برتن چولہے پر رکھا ہے اور بچے اس کی طرف دیکھ دیکھ کر سو جاتے ہیں، یا اس نوجوان کے خون کا بدلہ لے جس کی قیمت بس آٹے کا تھیلا تھا۔

جب آنے والی نسلیں یہ باب پڑھیں گی تو وہ یہ نہیں پوچھیں گی کہ فلسطینی کیوں غصے میں تھے۔ وہ پوچھیں گی؛ دنیا کیسے کھاتی رہی، قحط صرف جسمانی نہیں، اخلاقی اور سیاسی ہے۔ یہ حکمتِ عملی ہے۔ جب غزہ بھوکا مر رہا تھا؟ اور پھر بھی دنیا کو خوش فہمی کھلائی جاتی رہی اور وہ اس کو نوش کرتی رہی۔

(بحوالہ: ''دی وائر اردو ڈاٹ کام''، ۲۰؍اگست ۲۰۲۵ء)

یورپ اور ایشیا کے درمیان معلّق رُوس

Alexei Bayer

امریکی ریاست الاسکا میں امریکا اور روس کے صدور کی حالیہ ملاقات کے بعد سے روسی پروپیگنڈا بازوں نے ایک بار پھر زور وشور سے امریکا کے بارے میں وارم اَپ شروع کر دیا ہے۔ خیر، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ روس ایک بار پر مغرب یا یورپ کی طرف زیادہ جھکنا چاہتا ہے اور اُسے یہ بات زیادہ پسند ہے کہ اُسے یورپی قوّت قرار دیا جائے۔

روس چاہتا ہے کہ ایک بار پھر یورپ سے اُس کے تعلقات معمول پر آئیں، کشیدگی کا خاتمہ ہو اور بحرِ اوقیانوس کے خطے میں ایک اور ایسا اتحاد تشکیل دیا جائے جس میں امریکا شامل نہ ہو یعنی اُسے باہر ہی رکھا جائے۔ ایک دنیا یہ بات جانتی ہے کہ صدر ٹرمپ کی طرح روسی صدر ولادیمیر پیوٹن بھی یورپی انداز کی جمہوریت کو زیادہ پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ روس اِس وقت یورپ سے جتنا دور ہے، اُتنا پیٹر دی گریٹ کے عہد میں نہیں تھا۔ ایک زمانہ تھا جب روسی اشرافیہ اس بات کو ترجیح دیتی تھی کہ روس کو یورپی قوت کے طور پر گردانا جائے۔ اِس میں روس کا زیادہ فائدہ تھا۔ یورپ تب بھی دنیا کا سب سے ترقی یافتہ خطہ تھا اور اُس کی اِس حیثیت کا روس کو فائدہ ہی پہنچتا تھا۔

جغرافیائی شواہد

روس کو رقبے کے لحاظ سے یورپ کا سب سے بڑا ملک قرار دیا جا سکتا ہے، گو کہ اِس کا ۷۷ فیصد رقبہ ایشیا میں واقع ہے۔ آبادی کا معاملہ بالکل اُلٹ ہے یعنی ۷۷ فیصد روسی اپنے ملک کے یورپی حصے میں رہتے ہیں۔ ملک کے تمام بڑے شہر بھی اِسی طرف واقع ہیں۔

روس کا سرکاری نشان (دو سَروں کا عقاب) بھی اِس بات کی واضح نشاندہی کرتا ہے کہ یہ ملک یورپ اور ایشیا میں واقع ہے۔ اِن دونوں کو قریب لانے کے بجائے روسی قیادت نے ہمیشہ منقسم سیاسی شناخت کو ترجیح دی ہے۔ وہ کُھل کر اعلان نہیں کرتی کہ روس ایشیائی ہے یا یورپی۔ روسی قیادت ضرورت کے مطابق ایشیائی بھی رہتی ہے اور یورپی بھی۔ روسی اشرافیہ حالات پر نظر رکھتی ہے اور جب بھی ضرورت پڑتی ہے تب یورپی یا ایشیائی شناخت پر زور دیتی ہے۔ بیک وقت دو کشتیوں میں سفر کا معاملہ خاصی طویل مدت کا ہے۔

روس کا پیٹر پرنسپل

روس میں چار پانچ صدیوں کے دوران بہت کچھ تبدیل ہوتا رہا ہے۔ اٹھارہویں صدی کے اوائل میں زار پیٹر نے اپنی عظیم سلطنت کے انتہائی مغربی سِرے پر نیا دارالحکومت، سینٹ پیٹرز برگ، قائم کیا۔ معروف روسی شاعر الیگزینڈر پُشکِن کے مطابق زار پیٹر نے اِس دارالحکومت کی صورت میں یورپ میں جھانکنے کے لیے ایک کھڑکی بنائی۔

زار پیٹر نے اطالوی ماہرینِ تعمیرات اور فنکاروں کو مدعو کیا تاکہ وہ خالص یورپی انداز کا دارالحکومت تخلیق کریں۔ ساتھ ہی ساتھ روس میں کام کرنے کے لیے دوسرے یورپی پروفیشنلز کو بھی بلایا۔ زار پیٹر کی خواہش تھی کہ روس اپنے انداز سے یورپی محسوس ہو۔ وہ روس کی عمومی طرزِ زندگی کو غیر معمولی تبدیلیوں سے ہمکنار کر کے اُسے خالص یورپی لَمس دینا چاہتا تھا۔

سوال محض معاشرے اور معیشت کو یورپی رنگ دینے کا نہیں تھا۔ زار پیٹر کی خواہش تھی کہ پورا روسی معاشرہ تمام ہی معاملات میں یورپی انداز کا دکھائی دے۔ اِس کے لیے لازم تھا کہ تمام ہی معاملات کو یورپی رنگ میں رنگنے کی کوشش کی جاتی اور زار پیٹر نے یہی کیا۔ اُس نے یورپی انداز کی جدید زمینی اور بحری فوج تیار کی اور اُس وقت کی بڑی یورپی طاقت یورپ کو میدانِ جنگ میں شکست سے دوچار کیا۔

روس پر منگول اثرات مِٹانے کی کوشش

زار پیٹر نے روس کو مکمل طور پر تبدیل کرنے کے لیے بہت زور لگایا، بہت محنت کی، بہت توجہ دی۔ منگولوں نے تب دو صدیوں تک روس کے بیشتر خِطّوں پر راج کیا تھا۔ اُن کے اثرات بہت گہرے تھے۔ زار پیٹر کی خواہش تھی کہ روس کو منگولوں کے اثرات سے پاک کیا جائے اور خالص یورپی انداز فراہم کیا جائے۔ وہ روس کو مکمل یورپی قوم میں تبدیل کرنے پر کمر بستہ تھا۔ اُسے ہالینڈ کا پرچم بہت اچھا لگتا تھا۔ روس کے لیے نیا پرچم تیار کیا گیا اور اِس میں سفید، نیلے اور سُرخ رنگوں کا انتخاب کیا گیا۔

زار پیٹر سے ایک بڑی غلطی سرزد ہوئی جس کے نتیجے میں وہ روس کو اپنی مرضی کے مطابق تبدیل کرنے میں خاطر خواہ حد تک کامیاب نہ ہو سکا۔ اِس کی بہت سی وجوہ تھیں۔ ایک بنیادی سبب یہ تھا کہ روس کو یورپ کے رنگ میں رنگنے کے لیے زار پیٹر نے جو کچھ بھی کیا، وہ صرف طاقت کے ذریعے کیا۔ روس کو یورپی رنگ میں رنگنے کے لیے ناگزیر تھا کہ یورپ میں تب پائی جانے والی سیاسی سوچ بھی اپنائی جاتی، سیاسی طور طریقے بھی اپنائے جاتے۔ زار پیٹر نے ہالینڈ اور انگلینڈ میں تب مروّج سیاسی یعنی جمہوری سوچ اپنانے کے بارے میں خاطر خواہ حد تک نہیں سوچا۔ اُس نے ایشیائی انداز کی مطلق العنان نوعیت کی بادشاہت برقرار رکھنے کو ترجیح دی جس میں سب کچھ ایک شخصیت میں سمو دیا جاتا تھا اور اختیارات کے حوالے سے چیک اینڈ بیلنس برائے نام بھی نہ تھا۔

صدر ولادیمیر پیوٹن کی حکمرانی میں روس ایک بار پھر منگول دور کی کیفیت کو اپنانے پر تُلا ہوا ہے۔ زار پیٹر کی طرح پیوٹن نے بھی ساری طاقت اپنی شخصیت میں سمیٹ لی ہے۔ وہ کسی کو بھی اختیارات دینے کے مُوڈ میں نہیں۔

روس کو یورو پیانے کا بلند نقطہ

روس کو یورپ کے رنگ میں رنگنے کی کئی کوششیں کی گئی ہیں۔ اِس حوالے سے سب سے زیادہ بلند نقطہ ۱۹۱۷ء تھا۔ تب روس کی قُرونِ وسطیٰ کی بادشاہت کو بالآخر اُکھاڑ پھینکا گیا اور مختصر سے دورانیے کے لیے روس کو جمہوریہ میں تبدیل کیا گیا۔

اِس کے بعد ولادیمیر لینن کی واپسی ہوئی۔ اُس نے یورپ کے کئی شہروں میں برسوں جلاوطنی گزاری۔ روس واپسی کے بعد لینن نے انتہائی جابرانہ انداز سے روس کو نئی شکل دی۔ اِس کے لیے کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز کے فلسفے اور تحریروں کو بروئے کار لایا گیا۔ یہ دونوں مفکّرین جرمن تھے اور انہوں نے زندگی انگلینڈ میں گزاری۔

لینن اور اُس کے ساتھیوں نے روس کو دنیا کی پہلی اشتراکی ریاست میں تبدیل کیا۔ روس کا حلیہ تبدیل ہو گیا۔ سبھی کچھ بدل گیا۔ جب اشتراکی ریاست قائم ہوئی تو سبھی کچھ حکومت کے ہاتھ میں آ گیا۔ لوگ ہر معاملے میں حکومت کی طرف دیکھنے پر مجبور ہو گئے۔ ایسے میں لینن کے ساتھیوں نے یہ بلند بانگ دعویٰ کیا کہ ترقی کی دوڑ میں ایک زمانے سے پیچھے رہے روس نے، جس کی ۸۰ فیصد آبادی ناخواندہ کسانوں پر مشتمل تھی، یورپ کی ترقی یافتہ اقوام کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اُن کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ روس اب یورپی صنعتی انقلاب کی قیادت کرے گا اور ساتھ ہی ساتھ باقی دنیا کی بھی اور یوں اب اشتراکیت ہی دنیا کا ناگزیر مستقبل ہے۔

ایشیا میں ماسکو

اشتراکیت نے روس کو پوری طرح تبدیل کر دیا تھا۔ ہر طرف صرف اور صرف جبر کا ماحول تھا۔ ملک بھر میں لوگ سہمے ہوئے تھے۔ جن کے ہاتھ میں اقتدار تھا، وہ اپنی مرضی کے مطابق کوئی بھی فیصلہ کرتے تھے اور اُسے اہلِ وطن پر ٹھوپ دیتے تھے۔ اِنہی جابرانہ تبدیلیوں کے موسم میں لینن نے روس کا دارالحکومت ماسکو منتقل کیا۔ سینٹ پیٹرز برگ یورپ میں تھا اور ماسکو ایشیا سے نزدیک تر۔

دوسری طرف جرمن یا ڈچ زبان سے قریب سمجھا جانے والا اور عیسیٰ علیہ السلام کے ایک معروف حواری سے موسوم سینٹ پیٹرز برگ بھی تبدیلی کے مرحلے سے گزرا۔ اُسے لینن گراڈ کا نام دیا گیا۔ یوں اِس شہر سے یورپ کا ہر قسم کا تعلق ختم ہو گیا۔

انقلاب کی خود ساختہ ناکامی

کارل مارکس اور فریڈرک اینگلز نے اپنی تحریروں اور فلسفے میں اِس بات کی بھرپور وکالت کی تھی کہ اشتراکیت کو پوری دنیا میں متعارف اور نافذ کیا جائے مگر ایسا کرنے کے بجائے روسی قیادت نے اپنی سرحدیں بند کر دیں اور ملک کو آہنی پردے کے پیچھے دھکیل دیا۔

روس کو اس قدر بند کر دیا گیا کہ وہاں جانا اور وہاں سے کسی کا آنا دوبھر ہو گیا۔ سوویت حکومت نہیں چاہتی تھی کہ ملک سے کوئی بھی بات باہر جائے۔ معلومات کی ترسیل بھی اِس طور روکی گئی کہ روس یا سوویت یونین کی حدود میں رہنے والوں کو معلوم ہی نہیں ہو پاتا تھا کہ باقی دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ اشتراکیوں نے یہ پروپیگنڈا کیا کہ جو کچھ مارکس اور اینگلز نے کہا ہے، وہی بالکل درست ہے اور یہ کہ یورپ میں پائے جانے والے خیالات ناقص اور زہریلے ہیں جو روس کے خالص اور پاکیزہ اشتراکی معاشرے کو بھی گندا اور زہریلا کر سکتے ہیں۔

یورپی جمہوریت کو اپنانے کی کوشش

۱۹۹۱ء میں سوویت یونین کی تحلیل کے بعد روس نے ایک بار پھر یورپی جمہوریت کو اپنانے کی کوشش کی۔ آزادانہ و شفاف انتخابات کرائے گئے۔ روس نے اپنی سرحدیں کھولیں اور بہت سی عالمی تنظیموں میں شمولیت بھی اختیار کی۔ لینن گراڈ ایک بار پھر سینٹ پیٹرز برگ بن گیا۔ اِس بار جمہوریت ایک عشرے تک برقرار رہی۔

اور ایک بار پھر سینٹ پیٹرز برگ نے یورپ سے پسپائی اختیار کرنے کے معاملے میں پہل کی۔ یہ اکیسویں صدی کی آمد کے موقع پر ہوا۔ ولادیمیر پیوٹن لینن گراڈ میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ کے جی بی کے سربراہ بھی رہے تاہم مجموعی طور پر، سیاسی اعتبار سے، وہ بالکل گمنامی میں تھے۔ اُنہیں روس کے سابق صدر بورس یلسن نے اپنا جانشین منتخب کیا۔

یورپ سے دُور ہونے کا عمل

روسی صدر ولادیمیر پیوٹن کے بارے میں یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ وہ روس کو یورپ سے دُور لے جانا اور دُور رکھنا چاہتے ہیں۔ ولادیمیر لینن کی طرح پیوٹن نے بھی عُمر کا معقول حصہ یورپ میں گزارا۔ مشرقی جرمنی میں انہوں نے کے جی بی افسر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔ جرمنی میں گزارے ہوئے دن اُنہیں یورپ سے اچھی طرح متعارف کرانے میں خاصے معاون ثابت ہوئے ہوں گے مگر اِس کے باوجود وہ روس کو ایک بار پھر یورپ سے دُور لے جانے پر تُل گئے۔ اِس وقت روس ایشیا کی طرف جس قدر جھکا ہوا ہے، اُتنا پہلے کبھی نہیں جھکا تھا۔

پیوٹن کی اسٹریٹجک غلطیاں

المیہ یہ ہے کہ پیوٹن کا ایشیا کی طرف زیادہ جھکنا بھی یوکرین کو فتح کر کے یورپ میں بہت اندر تک روس کو اپنے اثرات پہنچانے کے قابل بنانے کی کوشش کے ناکام ہونے کا نتیجہ ہے۔ یوکرین کو مکمل طور پر فتح کرنا تو بہت دُور کا معاملہ رہا، مکمل طور پر حملوں کی زد میں لانا بھی کوئی پلیٹ میں رکھا ہوا حلوہ نہیں تھا۔ ولادیمیر پیوٹن کا تعلق انٹیلی جنس کمیونٹی سے رہا ہے مگر پھر بھی وہ اس بات کو سمجھنے سے قاصر رہے کہ اگر یوکرین کو ہڑپنے کی کوشش کی گئی تو یورپ کے متعدد ممالک اُٹھ کھڑے ہوں گے اور یوکرین کو میدانِ جنگ میں ثابت قدم رہنے کے قابل بنانے کے لیے جو کچھ ہو سکا، وہ ضرور کریں گے۔ ساتھ ہی ساتھ یورپ کی طرف سے روس پر اقتصادی پابندیاں نافذ کیے جانے کا امکان بھی تھا۔

روس کے یورپی حصے پر حملے

یوکرین پر روسی حملے کو ساڑھے تین سال ہو چکے ہیں۔ یوکرین کی طرف سے روسی سرزمین پر قائم آئل ریفائنریوں، فیکٹریوں اور بنیادی ڈھانچوں پر ڈرون حملے بڑھ چکے ہیں۔ روسی فوج کو شدید مزاحمت کا سامنا ہے۔ اب روس کو اپنی معیشت کے استحکام کے لیے ایشیائی حصے میں واقع صنعتی ڈھانچے پر انحصار کرنا پڑ رہا ہے۔

یورپ سے روس کی تجارت تو ٹھکانے لگ چکی ہے۔ یہ بہت بڑا مالیاتی نقصان ہے۔ روس کے خام تیل کے لیے یورپ بہت بڑی منڈی رہا ہے۔ قدرتی گیس اور دیگر اہم قدرتی وسائل کے لیے بھی یورپ ایک زمانے تک روس پر انحصار پذیر رہا ہے۔ یوکرین پر لشکر کشی کی پاداش میں روس کو یورپی مارکیٹ سے محروم ہونا پڑا ہے۔ اِس کمی کو پورا کرنے کے لیے وہ چین اور بھارت کو خاصے کم نرخ پر تیل بیچنے پر مجبور ہے۔

چین مدد کو آ پہنچا؟

روس میں بھی بڑا مینوفیکچرنگ سیکٹر ہے مگر پھر بھی اُسے اپنے استعمال کی ہزاروں چیزیں یورپ اور دیگر خطوں سے درآمد کرنا پڑتی ہیں۔ یوکرین جنگ کے نتیجے میں یورپ نے خود بھی روس سے تجارت بند کر دی اور متعدد ممالک کو پابند کیا ہے کہ وہ روس سے خام تیل، گیس اور معدنیات نہ خریدیں اور مصنوعات بھی نہ بیچیں۔ ایسے میں چین نے آگے بڑھ کر روس کی مدد کی ہے تاکہ اُس کی کنزیومر مارکیٹ خرابی سے دوچار نہ ہو اور مہنگائی کا گراف بلند نہ ہو۔ یورپ کی طرف سے چونکہ کچھ نہیں آ رہا، اِس لیے چین کی برآمدات بڑھ چکی ہیں۔

روس میں چینی مصنوعات کے لیے مسابقت برائے نام ہے کیونکہ روس میں لاگت بہت زیادہ ہے اور روسی مصنوعات چینی مال کے سامنے ٹِک نہیں سکتیں۔ روس میں سیاسی و معاشی امور کے بہت سے تجزیہ کار یہ شکوہ کر رہے ہیں کہ روس کو بیشتر معاملات میں چین پر بہت زیادہ انحصار کرنا پڑ رہا ہے۔ یہ انتہائی خطرناک رجحان ہے۔ اِس کے نتیجے میں چین کو روسی مارکیٹ میں اس طور قدم جمانے کا موقع ملے گا کہ پھر اُس کے قدم اُکھاڑنا آسان نہ ہوگا۔ ایک دَور تھا کہ روس صنعتی اعتبار سے بہت مضبوط تھا اور خطے کے متعدد ممالک کی مارکیٹوں پر چھایا ہوا تھا۔ اب اُس کی صنعتی بنیاد خاصی کمزور پڑ چکی ہے۔

(مترجم: محمد ابراہیم خان)

"When Russia was still Europe-minded".
("The Globalist". August 22, 2025)

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کی شائع کردہ کتاب

عورت
بدلتے مسلم معاشروں میں

مرزا محمد الیاس

قیمت: ۱۵۰۰ روپے

اکیڈمی بک سینٹر۔ فون: 021-36368020

پیوٹن کی اَحمقانہ جنگ

Alexei Bayer

سو سال قبل جرمنی کے فرماں روانے ملک کو ایک بلا جواز جنگ کی بھٹی میں جھونک دیا تھا۔ یہ عمل اُس کے لیے انتہائی نقصان دہ ثابت ہوا تھا کیونکہ پورا ملک اُس کی حماقت کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا تھا اور یوں جرمنی میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا تھا۔ روس کے صدر ولادیمیر پیوٹن کو بھی ایسی ہی صورتحال کا سامنا ہوسکتا ہے کیونکہ اُنہوں نے بھی ایک بلا جواز جنگ شروع کی ہے اور اِس جنگ کی بھٹی میں پورے ملک کے وسائل جھونک دیے ہیں۔

ولادیمیر پوٹن روسی خفیہ ادارے کے جی بی کے سربراہ رہ چکے ہیں۔ سیکریٹ ایجنٹ کے طور پر وہ جرمن شہر ڈریزڈن میں بھی تعینات رہے تھے۔ وہ جرمن بہت اچھی طرح جانتے ہیں مگر ایسا لگتا ہے کہ جرمن تاریخ سے اُنہوں نے کوئی سبق سیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔

صدر پیوٹن چاہتے ہیں کہ روس اپنی عظمتِ رفتہ بحال کرے۔ وہ روس کو ایک بار پھر بڑی طاقت کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ چین کے ساتھ مل کر وہ روس کو ایشیا کی سطح پر سب سے بڑا دیکھنے کے متمنی ہیں۔ آگے چل کر روس کے عالمی کردار کے بارے میں بھی سوچا جاسکتا ہے۔ مشرقی یورپ کو مسخر کر کے وہ مغربی یورپ کی طرف بھی بڑھ سکتے ہیں۔ اِس کے نتیجے میں کیا ہوسکتا ہے، اِس کا اندازہ تو کوئی بھی لگا سکتا ہے۔ اگر پیوٹن نے روس کی عظمتِ رفتہ کی بحالی کے عمل میں تاریخ کے سبق کو بھلایا تو یہ بات روس کے لیے انتہائی خطرناک ہوگی۔

اِس وقت ایسا ہی تو ہو رہا ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں جرمن حکمرانوں نے چند بھیانک غلطیاں کیں اور ملک کو عالمی جنگ کی بھٹی میں جھونک دیا۔ اِس کے نتیجے میں جرمنی کو بہت بڑے پیمانے پر تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ ایک بڑا سبق تھا جو سیکھا جانا چاہیے تھا۔ پہلی جنگِ عظیم نے یورپ کو تلپٹ کر دیا۔ سب سے زیادہ نقصان جرمنی کو پہنچا۔ جو ممالک جرمن فوجوں کی دسترس میں تھے، اُن کا حال بہت بُرا ہوا۔ پھر جرمنی کی بھی مٹی پلید ہوئی۔ صدر پیوٹن اب بھی پہلی جنگِ عظیم میں جرمنی کی شکست اور یوکرین میں روس کی دُرگت کے درمیان موازنہ نہیں کر رہے اور سبق سیکھنے کی کوشش نہیں کر رہے۔

دو احمقانہ اقدامات

روسی فوج نے فروری ۲۰۲۲ء میں یوکرین پر چڑھائی کی اور ایک ہمہ گیر نوعیت کی جنگ اِس ملک پر مسلط کردی۔ تب سے اب تک دنیا بھر کے تجزیہ کار اور مبصرین یوکرین میں روس کی کیفیت اور پہلی جنگِ عظیم میں جرمنی کی شکست کا موازنہ کر رہے ہیں اور اُن کا کہنا ہے کہ روس کے لیے یہ جنگ کسی بھی اعتبار سے سُود مند نہیں کیونکہ یوکرین نے تین سال سے بھی زائد مدت تک جس بھرپور انداز سے روسی افواج کا سامنا کیا ہے، اُس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اگر روس یہ جنگ فیصلہ کن انداز سے جیتنا چاہتا ہے تو اِتنا زیادہ خرچ کرنا پڑے گا کہ روسی فتح سے زیادہ تو یوکرین کی شکست فاتحانہ ثابت ہوگی۔ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک لڑی جانے والی پہلی عالمی جنگ کو بعد میں روس کی استعماری جنگ کا نام بھی دیا گیا۔ تاریخ پر نظر رکھنے والوں کا کہنا ہے کہ اِس جنگ نے مجموعی طور پر روس کو کمزور کیا اور یہ کمزوری اِس حد تک بڑھی کہ دوسری جنگِ عظیم میں جرمن فوج نے روس کو بھی زیرِ نگیں کیا۔ جرمنی کے ذریعے روس نے جو جنگ شروع کی تھی، وہ احمقانہ ثابت ہوئی کیونکہ پورا یورپ تو کیا ہاتھ آتا، روس کے لیے اپنی پوزیشن برقرار رکھنا بھی مشکل ہوگیا۔ کسی نے سوچا بھی نہ ہوگا کہ صدر پیوٹن یوکرین پر لشکر کشی کریں گے یا ایسا کرنے کے بارے میں سوچیں گے۔ دنیا بھر کے تجزیہ کار اور جنگوں کی تاریخ کے ماہرین کہہ رہے ہیں کہ یوکرین پر لشکر کشی کا روس کے پاس کوئی جواز نہیں تھا اور یہ اقدام اُس کے خلاف ہی گیا ہے۔

کرسمس تک گھر واپسی

پہلی جنگِ عظیم جولائی ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی تھی اور تمام ہی فوجیوں کو یقین تھا کہ کرسمس تک سب اپنے اپنے گھر میں ہوں گے۔ بالکل اِسی طور صرف ولادیمیر پیوٹن کو نہیں بلکہ یورپ میں یوکرین کے اتحادیوں کو بھی یقین تھا کہ کیئف چند ہی ہفتوں میں ہتھیار ڈال دے گا اور روس کی فتح کی راہ میں کوئی دیوار حائل نہیں ہوگی۔

کچھ ہی دنوں میں فریقین گھمسان کی لڑائی کی طرف چل دیے۔ دونوں نے ایک دوسرے پر تابڑ توڑ حملے شروع کیے۔ یہ سمجھا جا رہا تھا کہ یوکرین کمزور ثابت ہوگا اور روس کے لیے اُسے نگلنا کچھ خاص دشوار کام نہ ہوگا مگر دنیا یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ یوکرین کی حکومت اور افواج، دونوں نے غیر معمولی مزاحمت کی اور روسی افواج کو ناکوں چنے چبوا دیے۔ یوکرین کے شہروں پر قبضے کے لیے روسی فوج نے جو حملے کیے، اُنہیں ناکام بنانے کے لیے سخت مزاحمت کی گئی۔ کئی معرکوں میں فریقین کو غیر معمولی جانی نقصان سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ پہلی جنگِ عظیم چار سال اور چار ماہ تک جاری رہی تھی۔ یوکرین جنگ بھی اگلے سال جون میں اِتنے ہی دورانیے کی ہوجائے گی۔

خوش فہمیوں کی دُنیا

پہلی جنگِ عظیم کے چار سال مکمل ہونے پر ایسا لگ رہا تھا کہ قسمت جرمنی پر مہربان ہے۔ جرمن فوج کا عزم بہت بلند تھا اور اُس کا جوش و خروش بھی قابلِ دید تھا۔ ۱۹۱۷ء کے اواخر میں آسٹرین اتحادیوں نے اٹلی پر بھرپور حملہ کیا۔ یہ حملہ کامیاب رہا۔ اطالوی افواج کو کیپوریٹو کے معرکے میں منہ کی کھانا پڑی اور ہزاروں ہلاکتیں واقع ہوئیں۔ اِس کے نتیجے میں اٹلی جنگ سے باہر ہوگیا کیونکہ اُس میں مزاحمت کی ذرا سی بھی سکت باقی نہ رہی تھی۔

اُسی وقت مشرق میں جرمنی نے ایک بڑا جُوا کھیلا۔ ولادیمیر لینن کو سوئٹزرلینڈ سے سینٹ پیٹرز برگ کا سفر کرنے دیا گیا جس کے نتیجے میں محنت کشوں نے روس میں اقتدار پر قبضہ کرلیا۔ اُنہوں نے بریسٹ، لِٹوسک کا معاہدہ کیا جس کے تحت جرمنی کو پولینڈ، بالٹک ریاستوں اور یوکرین کے چند حصوں کا کنٹرول دیا گیا۔

پھر خدا جانے کیا ہوا کہ جرمنی کی ہمت جواب دے گئی۔ ایک سال بعد جرمن افواج فرانس اور بیلجیم پر متصرف تھیں اور جرمن سرزمین کسی بھی اعتبار سے بیرونی افواج کے زیرِ نگیں نہ تھیں مگر پھر بھی جرمن افواج نے ہتھیار ڈال دیے۔

پھر اُسی زمانے میں جرمنی میں انتہائی دائیں بازو کے عناصر اور مستقبل کی نازی پارٹی کے حامیوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ جرمنی کی پیٹھ میں چُھرا گھونپ دیا گیا ہے۔ یہ اشارہ تھا کہ سیاست دانوں اور یہودیوں نے جرمنی کو اتحادیوں کے ہاتھوں فروخت کر دیا ہے۔ جب اپنوں نے غداری کی، دھوکا دیا تب استعماری جرمنی معاشی، عسکری اور اخلاقی اعتبار سے کھوکھلا ہوگیا۔ ۱۹۱۸ء کے وسط میں جرمنی نے خود کو جنگ میں زندہ رکھنے کی آخری بڑی کوشش کی اور ایک بھرپور حملہ کیا۔ اِسے مارن کا دوسرا معرکہ کہا جاتا ہے۔ اس معرکے میں شکست کا سامنا کرنے کے بعد جرمنی کے پاس جنگ میں رہنے کی گنجائش ہی نہ رہی۔ دوسری طرف تازہ دم امریکی فوجی دستے یورپ پہنچ رہے تھے۔

آج کا روس رقبے کے اعتبار سے پہلی جنگِ عظیم کے زمانے کے جرمنی سے بہت بڑا ہے۔ اس وقت روس کی آبادی ۱۴ کروڑ ہے۔ دوسری طرف یوکرین کی آبادی تین تا ساڑھے تین کروڑ ہے۔ یہ حقیقت بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ بہت سے یوکرینی باشندے یا تو مقبوضہ علاقوں میں پھنسے ہوئے ہیں یا پناہ گزین کی حیثیت سے جی رہے ہیں۔

یورپ اور امریکا اب بھی یوکرین کی پُشت پر ہیں۔ مغربی یوکرین کے لیے لازم ہے کہ یوکرین میں روس کو شکست کا منہ دیکھنا پڑے۔ پہلی جنگِ عظیم کے دوران بھی یہی معاملہ تھا۔ اتحادی افواج بہت زیادہ تھیں اور جرمن افواج اُن کے سامنے بہت دیر تک ٹِک نہیں سکتی تھیں۔ نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا چاہیے تھا۔ سب کو اندازہ تھا کہ یورپ اور امریکا کامل کر جرمنی کے خلاف میدان میں آنا رائیگاں نہیں جاسکتا۔

آج یوکرین کے لیے صورتحال پہلی جنگِ عظیم کے جرمنی کے مقابلے میں کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ یوکرین کی صنعتی بنیاد بہت مضبوط نہیں۔ اُس کی معیشت بھی نمایاں طور پر متاثر ہوچکی ہے مگر امریکا اور یورپ اُس کی پُشت پر کھڑے ہیں۔ روس کو نیچا دکھانے کے لیے اُس کے تمام مخالفین یکجا ہوچکے ہیں اور یوکرین کی بھرپور معاونت کر رہے ہیں۔ جرمنی بھی یوکرین کی پُشت پناہی کر رہا ہے۔ کوئی بھی سوچ سکتا ہے کہ روس کے لیے امکانات کس حد تک ہیں اور یہ کہ وہ کتنی دیر تک میدانِ جنگ میں رہ سکتا ہے۔

ہمیں یاد ہونا چاہیے کہ ابتدائی مرحلے میں یورپ اور امریکا نے یوکرین کی مدد بہت احتیاط کے ساتھ کی۔ اُسے اسلحہ اور گولا بارود بھی سوچ سمجھ کر دیا گیا۔ ڈر یہ تھا کہ کہیں روسی قیادت بدحواسی میں یورپ کے کسی اور ملک پر حملہ نہ کردے۔ یوکرین کو ایسے ہتھیار دینے سے گریز کیا گیا جو حملوں کے لیے استعمال ہوں۔ اُسے دفاعی ساز و سامان دیا گیا تاکہ وہ حملوں کو ڈھنگ سے روکنے کے قابل ہوسکے۔ مغربی طاقتیں چاہتی تھیں کہ یوکرین روسی فوج کے حملے روکنے میں کامیاب رہے تاہم اُس پر حملے نہ کرسکے۔ ایسی صورت میں روسی قیادت مشتعل ہوکر یورپ کے دوسرے ممالک کو بھی جنگ میں گھسیٹنے کی کوشش کرسکتی تھی۔ روسی علاقوں کو نشانہ بنانے کی صورت میں اگر جنگ وسعت اختیار کرتی تو اُسے سمیٹنا مشکل ہوجاتا۔

ایسا نہیں ہے کہ یوکرین کے اتحادی اور ساتھی راتوں رات تیار ہوکر میدان میں آگئے۔ اندرونی سیاسی پیچیدگیوں پر قابو پانا بھی لازم تھا۔ روس کے حامی عناصر سے نپٹنا بھی تھا۔ اضافی ہتھیاروں کی پیداوار بھی آسان نہ تھی۔ کوئی بھی یورپی ملک اپنے اسلحے خانے سے کچھ دینے کا خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھا۔ یوکرین کے لیے ہتھیاروں اور گولا بارود کی اضافی پیداوار ممکن بنائی گئی۔ کئی ملکوں نے اضافی اسلحہ بنا کر یوکرین کو فراہم کیا۔ یہ عمل بھی بہت خطرناک تھا کیونکہ روسی قیادت بِدک جاتی تو جنگ طُول پکڑ سکتی تھی۔ یوکرین کی مدد کرنے والے تمام ممالک نے اس بات کو ترجیح دی کہ کسی نہ کسی طور لڑائی کو یوکرین تک محدود رکھا جائے اور یوکرین کی فوج کو روس میں بہت اندر تک حملے کرنے کی استعداد فراہم نہ کی جائے۔ یورپ تو اب بھی یوکرین کی مدد کر رہا ہے تاہم ڈونلڈ ٹرمپ کے دوبارہ صدر منتخب ہونے کے بعد سے امریکا کی پالیسی بھی بدلی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ وہ یوکرین کی مدد کرنے کے معاملے میں زیادہ آگے نہیں بڑھ رہا۔ سابق صدر جو بائیڈن کے دور میں امریکا نے اِس بات کو ترجیح دی کہ روس کو یورپ میں مزید آگے بڑھنے سے روکنے کے لیے یوکرین کی بھرپور مدد کی جائے اور جنگ کو یوکرین کی حدود سے آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔ اب معاملات بدل چکے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ امریکا نے یوکرین کو تنہا چھوڑ دیا ہے مگر ہاں وہ پہلا سا جوش و خروش نہیں۔ ڈونلڈ ٹرمپ کے دل میں روس کے لیے ہمیشہ نرم گوشہ رہا ہے۔ اب یوکرین اپنے لیے ہتھیار خود تیار کر رہا ہے۔ گولا بارود کا بھی یہی معاملہ ہے۔ یوکرین کے لیے ایسا کرنا لازم تھا کیونکہ کوئی بھی ملک کہاں تک اُس کی مدد کرسکتا تھا؟

روس کی معیشت کبھی اِتنی مستحکم نہیں رہی کہ عالمگیر سطح پر اپنی موجودگی کا احساس دلا سکے۔ یوکرین پر تھوپی جانے والی جنگ نے روسی معیشت کے لیے الجھنیں اور بڑھا دی ہیں۔ عالمی مارکیٹ میں روس کے لیے مسابقت کی فضا بہت زیادہ ہے۔ ویسے بھی روس ایسی چیزیں کم ہی بناتا ہے جو اُسے عالمی مارکیٹ میں بہت زیادہ شیئر دلا سکیں۔ وہ اب تک ہتھیاروں اور تیل کی برآمد ہی پر منحصر رہا ہے۔ یوکرین جنگ کی پاداش میں اُسے جن اقتصادی پابندیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے، اُن کے نتیجے میں بھی معیشت مزید کمزور ہوگئی ہے۔ روس میں کرپشن کا معاملہ بھی بہت سنگین ہے جس کے باعث معیشت کو مضبوط کرنا انتہائی دشوار ہوچکا ہے۔ سیاسی نظام میں بھی اچھی خاصی پیچیدگیاں پائی جاتی ہیں۔

روس کے مغربی حصوں میں صنعتوں اور توانائی کا بنیادی ڈھانچا مضبوط رہا ہے۔ اِس پر یوکرین کی افواج کے حملے بڑھتے رہے ہیں۔ یہ حملے بنیادی طور پر ڈرونز کی مدد سے کیے گئے ہیں۔ اقتصادی پابندیوں نے روس کو اس قابل نہیں چھوڑا کہ وہ اپنے مشرقی علاقوں میں صنعت اور توانائی کا نیا بنیادی ڈھانچا قائم کرے یا موجودہ ڈھانچے کی توسیع ہی کرے۔ ہتھیاروں کے لیے روس کو ایران اور شمالی کوریا پر بھی انحصار کرنا پڑا ہے۔

یوکرین کی افواج نے غیر معمولی عزم اور مہارت کا مظاہرہ کیا ہے۔ جانی نقصان بھی بہت ہوا ہے مگر پھر بھی یوکرین کی افواج روس کو ناکوں چنے چبوانے میں بہت حد تک کامیاب رہی ہے۔ اُس نے کئی کامیاب حملے کیے ہیں اور اہم شہر خرسون کو بھی دوبارہ حاصل کرلیا ہے۔

روس بہت حد تک تھک چکا ہے اور یوکرین اب تک کسی نہ کسی شکل میں تازہ دم ہے اور میدان میں اُس کے قدم ڈگمگائے نہیں ہیں۔ یوکرین جدید ترین ہتھیار عمدگی سے تیار کر رہا ہے۔ فوج میں بھی عزم اب تک جوان ہے۔ یہ سب کچھ روس کے خلاف جارہا ہے اور دن بہ دن یہ بات زیادہ کُھل کر سامنے آرہی ہے کہ صدر پیوٹن نے یوکرین پر لشکر کشی کرکے احمقانہ قدم اٹھایا ہے۔ وہ اب بھی اپنے فوجیوں کو ایک غیر منطقی جنگ میں دھکیل رہے ہیں۔ جانی نقصان کم ہونے کا نام نہیں لے رہا۔ یوکرین کی زمین پر قبضہ کرنے میں روسی فوج نمایاں طور پر کامیاب نہیں ہو پارہی تاہم اِس کے لیے جانی نقصان بہت زیادہ برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ روسی فوج کا مورال گرتا جارہا ہے اور معیشت اندر ہی اندر سڑ رہی ہے۔

اب یہ بات کُھل کر سامنے آچکی ہے کہ روسی فوج جنگ جاری رکھنے کی پوزیشن میں نہیں۔ جرمن حکمران قیصر ولہیم کی مانند صدر پیوٹن کو اب بہت جلد یہ اندازہ ہوچکا ہوگا کہ روسی افواج تھک چکی ہیں۔ اب اگر صدر پیوٹن بھی پسپا ہونے کا آپشن اختیار کرتے ہیں تو اُنہیں اپنے ہی عوام کی طرف سے زبردست غیظ و غضب کا سامنا ہوسکتا ہے۔ لوگ سوال تو کریں گے نا کہ جب جنگ کو منطقی نتیجے تک پہنچانے کی ہمت نہ تھی تو پھر جنگ چھیڑی ہی کیوں تھی۔

مہذب دنیا کو اس بات کی اُمید ہے کہ روس کے عوام اپنے صدر سے سوال ضرور کریں گے کہ ملک کو شدید نوعیت کی تباہی سے دوچار کرنے والی یہ جنگ چھیڑی ہی کیوں گئی، یوکرین پر لشکر کشی کی ہی کیوں گئی۔ سوال تو بنتا ہے۔ ایک احمقانہ جنگ نے پورے ملک کو وسیع البنیاد خرابیوں سے دوچار کردیا ہے۔

(مترجم: محمد ابراہیم خان)

"Putin ignores the lessons of World War-I for today's Russia".

("The Globalist". August 8, 2025)

ربیع الاول کے موقع پر اسلامک ریسرچ اکیڈمی کی خصوصی پیشکش :

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی درج ذیل تمام کتب پر 50 فیصد رعایت

نمبر شمار	نام کتاب/کتابچہ	مصنف	اصل قیمت	رعایتی قیمت
01	سیرت سید الابرار صلی اللہ علیہ وسلم	منیر احمد خلیلی	1200	600
02	مکی اسوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم	پروفیسر ڈاکٹر لیٰسین مظہر صدیقی	400	200
03	میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم	سید ابوالاعلیٰ مودودی رح	20	10
04	اوراق سیرت صلی اللہ علیہ وسلم	مولانا جلال الدین عمری	500	250
05	Sayyadina Muhammad (S.A.W)	محمد شفق ہاشمی	500	250
06	عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات وسرایا	مولانا سید احمد اکبر آبادی	200	100
07	عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا بلدیاتی نظم ونسق	نجمہ راجا لیٰسین	200	100
08	خانگی زندگی اور اسوہ حسنہ صلی اللہ علیہ وسلم	ڈاکٹر سید عزیز الرحمن	100	50
09	پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم	پروفیسر کے ایف رانا کرشنا رائو	40	20
10	رحمت لقب صلی اللہ علیہ وسلم	محمد رفیق قریشی	100	50
11	سیرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق حسنہ اور معاملات	ابوالقاسم شمس الزماں	100	50
12	سیرت صلی اللہ علیہ وسلم پیغام (کتابچہ)	سید ابوالاعلیٰ مودودی رح	60	30
13	سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم	سید ابوالاعلیٰ مودودی رح	60	30
14	رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نظام حکومت اور پاکستان میں اس کا نفاذ	سید ابوالاعلیٰ مودودی رح	60	30
15	حرف حرف روشنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جامع احادیث کا مختصر مجموعہ	کاشف حفیظ صدیقی	80	40

www.Irak.pk 0213-6368020 0334-3912769

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی

فلسطینی صحافیوں کی اَموات پر ماتم نہ کیجیے!

Eman Hillis

ایک برس قبل میری عزیز دوست اور رشتہ دار صحافی آمنہ حُمید، اپنے گیارہ سالہ بیٹے مَہدی کے ہمراہ نہایت سفاکانہ طریقے سے قتل کردی گئیں۔ اُنہیں براہِ راست اسرائیلی میڈیا کی جانب سے کی جانے والی اِشتعال انگیزی کے بعد نشانہ بنایا گیا۔

مجھے آج بھی وہ دن یاد ہے جب تعزیت اور دُکھ کے پیغامات اُن کے اہلِ خانہ کو مسلسل مَوصول ہوتے رہے۔ بین الاقوامی ذرائع اِبلاغ نے آمنہ کے شوہر سے رابطہ کر کے اَفسوس کا اِظہار کیا۔ اُن کے قتل اور اس سے قبل کی جانے والی اِشتعال اَنگیزی پر مضامین شائع ہوئے۔ سوشل میڈیا پر آمنہ کی کامیابیوں اور خدمات پر مبنی پوسٹیں پھیل گئیں۔

مگر اِن سب کے باوجود غم وفخر اور اِلزام کے مِلے جُلے جذبات تھے۔ لیکن یہ اِلزام اسرائیل پر نہیں جس نے قتل کیا، اور نہ ہی دنیا پر جس نے اِس قتل کو مُمکن بنایا، بلکہ آمنہ کے اُس فیصلے پر تھا کہ اُنہوں نے ایک ایسے وطن میں صحافت کو پیشہ بنایا جو عالمی قانون سے باہر سمجھا جاتا ہے۔

وقت کے ساتھ غم مدّھم پڑ گیا۔ آمنہ بُھلائی جانے لگیں اور کسی ادارے نے اور نہ کسی حکومت نے اُن کے قتل کی تفتیش کا مطالبہ کیا۔ یہی حال آج ناصر اسپتال خان یونس میں شہید ہونے والے صحافی حُسّام المصری، محمد سلامہ، مریم ابودَقّہ، احمد ابوعزیز اور معاذ ابوطٰہٰ کا بھی ہوگا۔ آج اُن کی شہادت عارضی طور پر سُرخیوں میں ہے، لیکن جلد ہی آمنہ کے قتل کی طرح فراموش کردی جائے گی۔

اگرچہ یہ صحافی بین الاقوامی قانون کے تحت مَحفوظ شہری تھے اور ایک ایسے طبّی مرکز میں پناہ لیے ہوئے تھے جو انسانی ہمدردی کے قانون کے تحت خصوصی تحفّظ رکھتا ہے، تب بھی کوئی اسرائیل کو جوابدہ نہیں ٹھہرائے گا۔ اسرائیل اپنی جارحیت کو محض ''غلطی'' قرار دے گا اور دنیا اِسے تسلیم کرلے گی۔

یہی معاملہ دو ہفتے قبل شہید ہونے والے انس الشریف، محمد قریقیہ، ابراہیم زاہر، محمد نوفل، مؤمن علوہ اور محمد الخالدی کے ساتھ ہوا۔ سوشل میڈیا کی تعزیتی تحریریں ماند پڑ گئیں، اور اُن کی شہادت کو 'ناقابلِ قبول' اور 'بین الاقوامی قانون کی سنگین خلاف ورزی' قرار دینے کے باوجود اب تک کوئی تفتیش نہیں ہوئی۔

جُون میں صحافی مَروہ مسلم کو اُن کے دو بھائیوں سمیت شہید کر دینا، مارچ میں حسام شباط کا قتل، جولائی ۲۰۲۴ء میں اسماعیل الغول اور رامی الرِفی کا خون اور دسمبر ۲۰۲۳ء میں میرے محترم استاد رفعت العلعیر کی شہادت۔۔۔ یہ سب اس تسلسل اور ڈھٹائی کی علامت ہیں جو اسرائیلی ریاست کے جرائم اور دنیا کی خاموشی کو مزید مستحکم کرتی ہے۔

ہر اسرائیلی ظلم کے بعد چھا جانے والی یہ خاموشی اگلے ظلم کی راہ ہموار کرتی ہے اور دنیا کو اسرائیل کا محاسبہ کرنے میں ایک بار پھر ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

فلسطینی عوام بارہا اِس عمل کو دَیکھ چکے ہیں۔ اِسی لیے اَب یہ یقین راسخ ہو چکا ہے کہ صحافت کا پیشہ اختیار کرنا گویا اپنے اور اپنے خاندان کے لیے مَوت کی سزا لکھوانے کے مترادف ہے۔

میرا اپنا خاندان، جو برسوں تک نوجوانوں کو شعبۂ اَبلاغیات میں جانے کی ترغیب دیتا رہا، آمنہ کے قتل کے بعد اَب کسی کو اُن کے نقشِ قدم پر چلنے سے روکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں: ''یہ ایک تنہا راستہ ہے جہاں دنیا تمہیں بے یار و مددگار چھوڑ دیتی ہے۔''

جو افراد اِس وقت صحافت میں سرگرم ہیں، اُنہیں تاکید کی جاتی ہے کہ وہ اپنے کام کو محدود کریں اور نُمایاں ہونے سے گُریز کریں۔

آمنہ کے سُسر حامد صاحب، نے مجھ سے کہا کہ وہ اپنے دیگر چھ بچّوں کو کبھی بھی کسی ایسے شعبے میں جانے کی اجازت نہیں دیں گے جو کسی طور میڈیا یا صحافت سے متعلق ہو۔ اُن کے الفاظ تھے:

''نہ اداکاری، نہ صحافت۔۔۔ میں اُنہیں کبھی میڈیا کے سامنے نہیں آنے دوں گا۔''

انہوں نے مزید کہا:

''میں ہمیشہ نوجوانوں کو اس شعبے میں آنے کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ کہا کرتا تھا کہ یہ سچائی کا میدان ہے۔ مگر آمنہ کے بعد مجھے اس شعبے سے وابستہ ہر چیز سے نفرت ہوگئی ہے۔''

یہاں تک کہ آمنہ کے شوہر، سعد حسونہ جو خود بھی صحافی ہیں اور نوجوانوں کو اِس میدان میں آنے کی نصیحت کرتے تھے، اپنی اہلیہ کے قتل کے بعد رفتہ رفتہ اپنی سرگرمیاں کم کرنے لگے۔

خاموشی اور پسپائی نے صحافیوں کے اہلِ خانہ کو نہ ختم ہونے والے صدمات کے سوا کچھ نہیں دیا۔ آمنہ کے دس سالہ بیٹے محمد کی حالت اس کی مثال ہے، جس نے اپنی آنکھوں کے سامنے ماں اور بھائی کو دَم توڑتے دیکھا اور خود صحافی اسماعیل الغول کو بتایا کہ اس کا گھر ملبے کے نیچے دَب گیا ہے۔ آج تک وہ شدید نفسیاتی صدموں سے دَوچار ہے۔ وہ جب بھی رَوتا ہے تو چیخ کر کہتا ہے کہ اُسے اُن اسرائیلیوں کے پاس لے جایا جائے جنہوں نے اُس کی ماں کو مارا تاکہ وہ اُنہیں بھی قتل کردے۔

آمنہ کی پانچ سالہ بیٹی غِنا آج بھی اپنی ماں کی واپسی کی منتظر ہے اور اکثر روتے ہوئے کہتی ہے:

''آپ میری ماں کو کہاں لے گئے؟''

تقریباً ۲۳ ماہ کی اس ہولناک جنگ کے بعد بھی دنیا فلسطینی شہدا کے لیے صرف تعزیتی کلمات پر اِکتفا کرتی ہے اور اپنی ذمّہ داری سے پہلوتہی کرتی ہے۔

اب تک غزہ میں ۲۴۴ فلسطینی صحافی شہید کیے جاچکے ہیں۔ ان سب کے ساتھ ایک ہی رویّہ بَرتا گیا ہے۔ اُن کے قتل کو تفصیل سے دستاویزی شکل دی گئی، لیکن اُن کے قاتل کو جنگی جرم قرار دے کر سزا نہیں دی گئی۔ ۲۰۲۲ء میں جنین میں اسرائیلی اسنائپر کے ہاتھوں شہید ہونے والی شیرین ابوعاقلہ کا مقدمہ اِس باب کی تمہید تھا۔ اُن کی امریکی شہریت اور امریکی میڈیا کی تحقیقات بھی اُنہیں انصاف نہ دِلاسکیں۔

اگر فلسطینی صحافیوں کا ماتم کرنا آپ کے احساسِ جرم کو ہلکا کرتا ہے، اگر یہ آپ کو یہ اطمینان دیتا ہے کہ آپ نے اُن کے حق میں کچھ کر دیا ہے، تو پھر یہ ماتم بے معنی ہے۔ ہمیں مزید تعزیتی بیانات کی ضرورت نہیں، ہمیں انصاف چاہیے۔

(مترجم: محمود الحق صدیقی)

"Don't mourn the deaths of Palestinian journalists". ("Aljazeera". Aug 25, 2025)

برصغیر پاک و ہند کا معروف علمی و تحقیقی رسالہ

سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی

علی گڑھ (بھارت)

فی شمارہ: ۴۰۰ روپے (علاوہ ڈاک خرچ)

تازہ شمارہ حاصل کرنے کے لیے رابطہ کیجیے

اکیڈمی بُک سینٹر (کراچی)

فون: ۰۲۱-۳۶۳۶۸۰۲۰

MA'ARIF FEATURE - Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950